اُردو غزل پر حالی اور اُن کے معاصرین کی تنقید

از

شاہدہ بیگم

مقالہ برائے ایم. فل (اردو)

زیر نگرانی

پروفیسر مسز شربا حسین

شعبۂ اُردو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ

۱۹۸۶ء

DS-1641

Fed in Computer

CHECKED-2002

DS1641

شعبۂ اُردو
علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

3ا.3.1986
تاریخ .....

To whom it may concern

I certify that Miss Shahida Begum worked under my supervision to complete her M.Phil dissertation " Urdu Ghazal par Hali aur unke Measerin ki Tanqeed" (اردو غزل پر حالی اور ان کے معاصرین کی تنقید).

To the best of my knowledge her work is an original contribution.

S. Husain

(Prof. Mrs. Suraiya Husain)
Supervisor

اردو غزل پر حالی اور ان کے معاصرین کی تنقید

از

عاھدہ بیگم

مقالہ برائے ایم ۔ فل

زیر سرپرستی

پروفیسر ثریا حسین

شعبۂ اردو
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

۱۹۸۶ء

فہرست عنوانات

		صفحات	
۱۔	پیش لفظ	۱ - ۴	....
۲۔	اردو غزل کی تنقید تذکروں کی روشنی میں	۵ - ۲۰	....
۳۔	محمد حسین آزاد اور آب حیات	۲۱ - ۵۲	....
۴۔	الطاف حسین حالی اور مقدمۂ شعر و شاعری	۵۳ - ۷۶	....
۵۔	امداد امام اثر اور کاشف الحقائق	۷۷ - ۱۰۵	....
۶۔	حاصل کلام	۱۰۶ - ۱۰۹	....
۷۔	کتابیات	۱۱۰ - ۱۱۱	....

پہلا لفظ

محمد حسین آزاد اور آب حیات

پہلی لغزش

غزل اردو کی تمام اصناف شاعری میں مخصوص تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ بقول رشید احمد صدیقی "ہماری تہذیب میں غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے" غزل کے فن میں فارسی شاعری کی بہترین روایات اور ہند آریائی تلمیح کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ اردو شاعری کے مختلف ادوار میں مشاہیر نے اس فن پر اپنے مخصوص انداز میں تبصرے کئے ہیں اور نقاد و نے اس کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں غزل کے فن و فروغ ہوا اس میں کیفیات ذہنی و واردات قلبی کے اظہار کے ساتھ روح عصر کی ترجمانی بھی کی گئی ہے۔ تصوف و اخلاق اور سیاسی و معاشرتی مسائل کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ یہی نہیں داخلی کیفیات و خارجی معاملات کا بیان مختلف ادوار میں شعرا نے اپنے منفرد انداز میں کیا۔ حالی سے پہلے مورخوں اور تذکرہ نگاروں نے روایتی انداز میں غزل کی تنقید کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ میر کے "نکات الشعرا" سے لے کر محمد حسین آزاد کے "آب حیات" تک اردو غزل کی تنقید اس صنف کی تاریخ اور شعرا کے فن کی شعری خصوصیات بالخصوص صنائع بدائع کے استعمال اور آہ و واہ کی حد تک محدود رہی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ شاعری پر مشرقی تنقید کے اصول اس زمانے تک مرتب نہیں ہوئے تھے اور مشرقی تنقید ارسطو تو کیا ورڈس ورتھ اور آرنلڈ کی تصانیف سے بھی عاری تھی۔ حالی اردو شاعری کے پہلے نقاد ہیں جنہیں تاریخی اعتبار سے وہی حیثیت حاصل ہے جو انگریزی تنقید میں ڈرائیڈن کی ہے۔ حالی نے شاعری بالخصوص غزل کی تنقید میں بہت حد تک سائنسی اور معروضی انداز اختیار کیا وہ نہ صرف اردو اور فارسی شاعری کی بہترین روایات سے واقف تھے بلکہ اعلیٰ فنی مقاصد کے پیش نظر اردو غزل کو رسمی اور

فرسودہ عناصر سے پاک کرکے اسے نئی زندگی دینا چاہتے تھے۔ "مقدمہ شعر و شاعری" کو ہم بجا طور پر اردو کی "بوطیقا" کہہ سکتے ہیں۔

میرے مقالہ کا موضوع "اردو غزل پر حالی اور ان کے معاصرین کی تنقید" ہے۔ اگرچہ یہ میدان کافی وسیع ہے لیکن میں نے اپنے مقالہ کو حالی کے علاوہ ان کے چند ممتاز معاصرین تک محدود رکھا ہے جنھوں نے غزل کی تنقید کو نئی سمت دی۔ چنانچہ زیر نظر مقالہ میں حالی، محمد حسین آزاد اور امداد امام اثر کی مایۂ ناز تصانیف "مقدمہ شعر و شاعری" "آب حیات" اور "کاشف الحقائق" پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے ان مشاہیر کے ادبی و جمالیاتی نظریات کو اگر کریدنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان تمام نقادوں نے اپنے طور پر غزل کے فن پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اپنے اعتراضات کے باوجود حالی کہتے ہیں کہ غزل اس قدر قدیم اور ہر دلعزیز صنف سخن ہے جس سے یکسر اجتناب نہیں کیا جاسکتا۔ اور نہ اس کو جڑ سے اکھاڑا جاسکتا ہے۔ لہذا ہمارے وطن میں یہ ہونی چاہئے کہ اس میں اصلاح کی جائے اور اس کے محدود موضوع کو وسیع کیا جائے۔ اسی طرح محمد حسین آزاد اور امداد امام اثر نے بھی غزل پر تنقید کرتے ہوئے خود کو غزل کا حامی بتایا ہے۔

زیر نظر مقالہ میں میں اردو غزل کی تنقید کے ابتدائی دور کا جائزہ لیا گیا ہے۔ حالی لازمی طور پر انیسویں صدی کے نقادوں میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ آزاد "آب حیات" میں تذکرہ کے رنگ میں لکھتے ہوئے آخری ابواب میں نئی غزل کی بشارت دیتے ہیں۔ حالی کا انداز تنقید مصلحانہ ہے لیکن ان کے ممتاز معاصر امداد امام اثر بذاتی طور پر غزل کے حامی ہیں۔ وہ داخلی یا بزمیہ شاعری کے معیار سے غزل کو سب سے تہذیب یافتہ صنف قرار دیتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے انھوں نے غزل کے معترضین (بالخصوص حالی) کی پرزور مخالفت کی ہے اور قدما کے کلاسیکی طرز تغزل کو فوقیت دی ہے

اگرچہ ان اہم تالیف میں اردو شاعری کے دوسرے اصناف پر بھی بحث ہے لیکن راقم الحروف نے صرف غزل کی تنقید اور تجزیے پر اکتفا کی ہے۔ اب تک شاید ہی کسی نقاد نے اردو شاعری کے کسی دور پر خاص غزل کے نقطۂ نگاہ سے توجہ کی ہے۔ اس تنقیدی جائزے سے ہمارے سامنے فن غزل سے متعلق کئی اہم پہلو آتے ہیں۔ ان تینوں نقادوں کے مطالعے سے ہمیں اگر انہیں شعری سرمائے بالخصوص غزل کی عظمت کا احساس ہوتا ہے تو دوسری طرف اس کو نتیجے زمانے کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ رہنے کی کوشش بھی قابل تعریف ہے۔ بیسویں صدی میں غزل پر لکھنے والے تمام مورخوں، نقادوں اور مبصروں نے "آب حیات" "مقدمہ شعر و شاعری" اور "کاشف الحقائق" سے خوشہ چینی کی ہے اور اپنے اپنے انداز میں غزل کی تنقید کا حق ادا کیا ہے۔

ان تین مشہور نقادوں کے علاوہ مقالہ کے ابتدائی باب میں چند مشہور تذکرہ نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے جن کے یہاں ہمیں غزل کی تنقید کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں۔ اس مختصر باب میں میر تقی میر (نکات الشعرا) قدرت اللہ قاسم (طبقات الشعرا) غلام ہمدانی مصحفی (تذکرۂ ہندی) مرزا علی لطف (گلشن ہند) اور نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ (گلشن بیخار) کے تبصروں اور تذکروں کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔ مقالہ کے آخری باب میں حاصل کلام کے طور پر بھی جائزہ لیا گیا اور ان کے معاصرین کے درمیان قدر مشترک تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور ان مشاہیر کی غزل کی اصلاح کے جذبے کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔

میں اپنے شعبہ کے تمام اساتذہ بالخصوص اپنے نگران پروفیسر ثریا حسین صاحبہ صدر شعبہ اردو و پروفیسر عتیق احمد صدیقی کی شکر گزار ہوں کہ ان کی شفقتوں کے زیر سایہ یہ مقالہ تکمیل کو پہنچا۔ میں مولانا آزاد لائبریری کے اردو سیکشن انچارج ڈاکٹر ضیاء الانصاری، سلیم احمد خاں اور اردو سیمینار انچارج مسز رابعہ سہیل کی پرخلوص اعانت

اور فقط ان کے لئے ممنون ہوں ۔ حق تو یہ ہے کہ ان کی مدد سے دشوار گزار راہیں میرے لئے ہموار ہوگئیں ۔ آخر میں میں اپنے نائب مستقیم احمد کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جنہوں نے اپنا قیمتی وقت صرف کرکے مقالہ کو اپنے تکمیل تک پہنچانے میں کوتاہی نہیں برتی ۔

شاہدہ بیگم
(عاہدہ بیگم)
ریسرچ اسکالر
شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

اردو غزل کی تنقید تذکروں کی روشنی میں

اردو غزل کی تنقید تذکروں کی روشنی میں

غزل اردو ادب کی اہم ترین صنف سخن ہے اور اس میں اردو شاعری کا بہتر قابل قدر سرمایہ موجود ہے۔ متقدمین کے زمانے سے لے کر تاحال شاعروں، تذکرہ نگاروں، تاریخ نگاروں اور مبصروں نے اس کی ماہیت اور جمالیاتی عناصر سے بحث کی ہے۔ ابتدائی دور میں تذکرے زیادہ تر شعرا کے سوانحی حالات اور کلام پر سرسری جائزہ پیش کرتے ہیں۔ تذکروں میں سب سے زیادہ توجہ غزل کو شعرا اور ان کے تبصروں پر دی گئی ہے۔ اردو غزل بہت حد تک فارسی شاعری سے متاثر رہی لہذا اس پر تنقید بھی ابتدائی دور میں فارسی سے متاثر ہوئی۔

اردو غزل کی تاریخ نہ صرف دو ڈھائی سو برسوں میں اردو شاعری کی تاریخ ہے بلکہ اس میں ہماری معاشرتی اور تہذیبی زندگی کے نقوش بھی ملتے ہیں۔ متقدمین کی کسی شاعری میں اگرچہ تقلیدی اور [illegible] فنی عناصر ہر جگہ محسوس کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن غزل کو شعرا کے یہاں جذبات انسانی خصوصاً عشق و معرفت کے اظہار کو طرۂ امتیاز سمجھا گیا اور عام انسانی جذبات و کیفیات کے بیان کو بڑی اہمیت حاصل رہی۔ میر و درد کا دور اس رجحان کا نقطۂ عروج ہے۔ انیسویں صدی کے وسط میں غالب کی شاعری نے غزل کو دوسرے مقام تک پہنچا دیا ان کی غزل میں زندگی کے متنوع پہلوؤں کا احساس اور اس کی ترجمانی موجود ہے۔ چنانچہ حالی نے جب "مقدمہ شعر و شاعری" تصنیف کی تو غالب کو آئیڈیل شاعر کی حیثیت سے پیش کیا۔ اردو غزل کی تنقید دراصل حالی سے ہی شروع ہوئی لیکن اس سے پہلے تذکرہ نگاروں کے کارناموں کو نظر انداز کرنا تاریخی غلطی ہوگی۔

تذکروں پر بحث کرنے سے پہلے صنف غزل اور اس کے تاریخی پس منظر کو مد نظر رکھنا ضروری ہے اس میں کلام نہیں کہ غزل اردو کی مقبول ترین صنف ہے۔ رشید صاحب نے اسے "اردو شاعری کی آبرو" کہا ہے۔ اس کے انداز دلبری نے ہر دور میں لوگوں کو اپنا گرویدہ کیا۔ عوام و خواص، غریب و امیر سب ہی پر اس کا جادو چلا ہے۔ اگرچہ غزل کا بنیادی موضوع معاملات عشق ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس میں ذہنی کیفیات اور قلبی واردات کی ترجمانی کے نئے پہلو بھی شامل ہوتے رہے۔ احساسات و جذبات کو انسانی کی و بوقلمونی غزل میں ملتی ہے وہ کسی اور صنف میں نا پید ہے۔ اس آفاقیت کے باوجود غزل میں مشرقی انداز، مشرقی مزا اور آہنگ کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ جو مخصوص تہذیبی اور معاشرتی تہذیب کا نتیجہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایران و ہندوستان کا تجربہ صدیوں تک غزل کا تجربہ رہا ہے۔

اردو غزل اور تغزل میں ایرانی مذاق اور ایرانی روایات کو بڑا دخل ہے۔ رومی، حافظ، عرفی، نظیری اور طالب وغیرہ شعرا کے اثرات کو ولی، میر، سودا، درد اور مصحفی وغیرہ نے بہت حد تک اردو غزل میں سمو لیا۔ اردو غزل کی تنقید کا جائزہ لیتے وقت اس تاریخی پس منظر کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ تذکرے دراصل غزل کی تنقید کے ابتدائی نقوش ہیں۔ ان سے ہمیں متقدمین کے حالات زندگی اور ان کے کلام کا اندازہ ہوتا ہے۔

تذکروں کی تاریخی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں مگر شعرائے اردو کے تذکرے اپنی اہمیت کے باوجود تاریخ ادبیات کے جدید معیار پر پورے نہیں اترتے۔ مغربی اصول تنقید یا تاریخ نگاری کے واضح اثرات بیسویں صدی کی اردو تنقید میں ملتے ہیں۔ ڈاکٹر حنیف نقوی اسی کے اصول ہیں۔

" تذکرہ نویسی کا فن نہ تو براہ راست تاریخ نگاری کے ذیل میں آتا ہے نہ اسے فن سیرت یا سوانح نگاری کے تحت رکھا جا سکتا ہے۔ اور نہ اس کا دائرہ اور تنقید کی طرح اچھے برے کی پرکھ تک محدود ہے بلکہ درحقیقت ان تمام فنون یا اصناف ادب کا آمیزہ اور بجائے خود ایک فن یا صنف ادب ہے "[1]

تذکرہ نگار اپنے بیان میں شاعر کی زندگی، اس کی شخصیت اور عادات و اخلاق کے بیان کو وہی اہمیت دیتا ہے و اس کے کلام کو حاصل ہے لہذا ان تذکروں میں شاعر کے کلام اور اس کی خوبیات پر سرسری بحث ہی ممکن ہے۔ اس سے عموماً کلام کی چند واضح خصوصیات اور خامیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ آخر میں چند اشعار بطور نمونہ بھی کیے جاتے ہیں۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ اردو تذکرہ نویسی براہ راست فارسی اور عربی تذکرہ نگاروں سے متاثر ہوئے۔ لہذا ان کے بیان میں ان ہی اصولوں کی کارفرمائی نظر آتی ہے جو عربی و فارسی تذکروں میں موجود ہیں۔ جدید تنقید کے اصول و اسالیب کی روشنی میں تذکرے محض کتھونی معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر انصاف سے کام لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ان میں اردو شاعری بالخصوص اردو غزل کی تنقید کے ابتدائی نقوش موجود ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ تذکروں کی تنقید سرسری اور سطحی ہے اور اس کا تعلق زیادہ تر زبان و محاورہ اور عروض سے ہے لیکن اس سے انکار نہیں کہ اردو غزل خصوصاً متقدمین پر تذکرہ نگاروں نے ہی اپنا قلم اٹھایا۔ تذکرے اردو غزل کی تنقیدی تاریخ میں اپنی مخصوص اہمیت رکھتے ہیں۔

شعرائے اردو کے تذکرے نہ صرف اردو شاعری بالخصوص غزل پر ہمارا قدیم سرمایہ تنقید ہیں بلکہ اس عہد کے شعری مزاج کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔ یہ تذکرے بہت حد تک اردو شاعری کی اہم ترین صنف غزل پر تبصروں اور آرا پر مبنی ہیں۔ اس سلسلے میں اہم تصانیف حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر حنیف نقوی، شعرائے اردو کے تذکرے، نکات الشعرا سے گلشن بیخار تک، ص ۸۵۹

۱۔ نکات الشعرا ۔ میر تقی میر

خدائے سخن میر تقی میر تذکرہ نگاری میں بھی اولیت کا درجہ رکھتے ہیں ۔ ان کی تصنیف " نکات الشعرا " جو ۱۱۵۰ھ ۱۷۳۸ء میں منظر عام پر آئی ۔ شعرائے اردو کا پہلا تذکرہ ہے ۔ مولوی حبیب الرحمن شروانی نے " نکات الشعرا " پر اپنے مقدمہ میں لکھا ہے ۔

" میر صاحب نہایت باکمال مہذب ، مودب و مہذب ، زندہ دل باوضع ، انصاف پسند اور منکسر المزاج انسان تھے ۔ دوستی کے مراتب ان کے دستور العمل میں بہت وضاحت اور صفائی سے درج تھے ۔ ہر موقع پر اس کی تصریح لازم ہے ۔ بے تحقیق کسی بات کا لکھنا پسند نہیں کرتے تھے "۔[۱]

اس اقتباس میں محض لفظ انصاف پسند ہی سے میر کی تنقیدی صلاحیت کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے وہ عموماً شعرا کے بیان میں مختصر نویسی سے کام لیتے ہیں اور چند جملوں میں ان کے شعری کمالات پر اپنی رائے کی مہر ثبت کر دیتے ہیں ۔ ان کے یہاں شاعر کا کلام کسی صریح یا سرسری بات کا تفصیلی بیان نہیں ۔ آرزو جیسے شاعر کے بارے میں ہمیں صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑے " جید شاعر " تھے حقیقت یہ ہے کہ غزل کی تنقید اس زمانے میں ادبی محاسن پر مبنی تھی ۔ میر بھی مروجہ معائب سے بے نیاز نہیں رہ سکے ۔ ریختہ کی تعریف انھوں نے کچھ یوں کی ہے ۔ " ریختہ کہ عربیست بطور عجم فارسی بزبان اردوئے معلائے شاہجہان آباد ، دہلی " ۔ میر شاعروں پر تبصرہ کرتے ہوئے عموماً انصاف پسندی سے کام لیتے ہیں لیکن وہ تحقیق سے کتراتے نظر آتے ہیں ۔ وہ اپنی محدود معلومات کی تصریح بھی کرتے ہیں ہمیں ضمناً " شعرا کے بیان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ میر شعری کو گل و بلبل کی داستان نہیں سمجھتے لیکن ان کے یہاں اردو غزل کی جمالیاتی و نفسیاتی نکات کا فقدان ہے ۔ کہیں کہیں تاثراتی تنقید کی جھلکیاں ملتی ہیں مثلاً ان کے

۱۔ حبیب الرحمن خان شروانی ، نکات الشعرا ، ص ۳ ، ۴

ہمعصر ایک نوجوان اور کم پایہ شاعر میر شاد بھی اس تذکرے میں جگہ پا گئے ہیں۔ اس فیاضی کی وجہ محض ایک شعر ہے۔

عشق کی ناؤ پار کیا ہووے
جو یہ کشتی تری تو بس ڈوبی

"نکات الشعرا" میں جگہ جگہ میر کی تلخ نوائی بھی واضح ہے۔ وہ شاعروں کی سیرت و کردار اور ان کے کلام کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے مروت یا مصلحت سے کام نہیں لیتے۔ اس زمانے میں ایسی تنقید کا یہ اثر ضرور ہوا کہ بے مایہ اور کم پایہ شاعروں نے اپنا مقام پہچانا اور بڑے شاعروں نے اپنے کلام کے انتخاب کی ضرورت محسوس کی۔ "نکات الشعرا" میں میر نے حضرت امیر خسرو، مرزا عبدالقادر بیدل، سراج الدین علی خان آرزو، مرزا جان جاناں مظہر، شاہ مبارک، میاں شرف الدین، مصطفےٰ خان یکرنگ، محمد شاکر ناجی، میاں احسن اللہ، میر مغفرت علی، مرزا رفیع سودا، محمد حسین کلیم، خواجہ میر درد، اشرف علی خان، شیخ محمد حاتم، انعام اللہ خان یقین، ولی اورنگ آبادی، میر عبدالحی تاباں اور خود اپنی شاعری کا ذکر کیا ہے۔ میر تقی میر ریختہ کی مختلف خصوصیات کو اور اس کے فن کو "نکات الشعرا" کے خاتمہ میں بیان کرتے ہیں اور آخر میں اپنی شاعری کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے اپنے کلام پر رائے زنی کرتے ہیں۔ چھٹی چیز انداز ہے جو میں نے اختیار کیا ہے اور یہ تمام صفات پر محیط ہے۔ تجنیس و ترصیع، تشبیہہ و صفائے گفتگو، فصاحت و بلاغت، ادا بندی و خیال وغیرہ تمام چیزیں اس صفت کے ضمن میں آتی ہیں اور فقیر اس چیز سے مطلوبا ہوتا ہے۔ ہر کوئی اس فن میں طرز خاص رکھتا ہے اور اس مطلب کو سمجھتا ہے۔ یہ چیز عوام کے کام کی نہیں ہے۔ یہ باتیں جو میں نے لکھی ہیں میرے دوستوں کے لئے صد سند کی حیثیت رکھتا ہے نہ کہ ہر ایک کے لئے۔ اس لئے کہ شعر و شاعری بڑی وسیع ہے۔

ان میں کم و بیش تمام شعرا صنف غزل میں طبع آزمائی کرتے رہے سودا کے بارے میں لکھتے ہیں

"المتخلص سودا کہ جوانیست خوش خلق ..... سر آمد شعرائے ہندی اوست بسیار خوش گو است۔ ہر شعرش طرفہ لطف رستہ رستہ در چمن بندی الفاظش گل معنی دستہ دستہ ہر مصرع بر بستہ اش را سرو آزاد بندہ ..... شاعر ریختہ چنانچہ ملک الشعرائے ریختہ او را شاید قصیدہ در ہجو است ....."[1]

میر سے سودا کی معارانہ چشمک تھی پھر بھی وہ ان کی شاعرانہ صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کو اپنے تذکرہ میں خاص مقام دیتے ہیں ۔ ان کے خیال میں وہ ایک زبردست قصیدہ نگار تھے۔ اور خاص کر ماہر ہجویات ۔ یوں تو انھوں نے تمام صنف سخن پر طبع آزمائی کی لیکن ملک الشعرائی کا تاج قصیدہ اور ہجو کی وجہ سے نصیب ہوا ۔ مرزا جان جاناں مظہر کے متعلق لکھتے ہیں ۔

"مظہر تخلص مرد یست مقدس مظہر درویش عالم صاحب کمال شہرہ عالم بے نظیر معزز مکرم ۔ پدر او مرزا جان جان نام داشت ۔ دیوان مختصر شعر فارسی او بنظر فقیر مولف آمدہ است"۔[2]

میر کے خیال میں مرزا مظہر درویش مزاج تھے اور اپنا وقت یاد الٰہی میں صرف کرتے تھے مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے اردو غزل میں بھی طبع آزمائی کی لیکن حقیقت میں وہ فارسی کے شاعر تھے ۔ ان کا فارسی دیوان موجود ہے ۔

میر عبد الحئی تاباں کے لئے وہ کہتے ہیں ۔

"سید نجیب الطرفین ، مولد او شاہجہان آباد است ۔ بسیار خوش فکر و خوبصورت ، پاکیزہ سیرت معشوق عاشق مزاج تاحال در فرقہ شعرا ہمچو

۱۔ مصنفہ میر تقی میر ، نکات الشعرا ، ص ۲۱
۲۔ ایضاً ص ۵

او شاعر خود آهر از ممکن بطون بعرصهٔ ظهور جلوه گر نشده بود ـ
هرچند عرصهٔ سخن او همین دو لفظ ائیر گل و بلبل تمام است"۱

میر عبد الحی تاباں کی خوبصورتی و خود سیرتی و خود فکری کا ذکر ترتیب ہوئے ہیں اور ان کی شاعری کا دار و مدار گل و بلبل کے الفاظ پر مبنی بتاتے ہیں کیونکہ انہوں نے علامت کے طور پر گل و بلبل کو استعمال کیا ہے ـ اس سے مراد عاشق اور محبوب ہے جو آدمی میں ولولہ پیدا کرتا ہے ـ

اگرچہ "نکات الشعرا" انگریزی نقاد ڈاکٹر انسن کے "LIVES OF POETS" کی طرح شاعروں کے حالات و مآثر تفصیلی جائزہ نہیں پیش کرتا لیکن میر کا نقطۂ نظر بہت حد تک انسن کی طرح علمی اور ادعائی (DOGMATIC) معلوم ہوتا ہے ـ اس کتاب کی مناسبت سے ایسے وہ میر کا دوسرا تنقیدی نظریہ بھی ہے ـ اردو غزل کی تنقید کے ابتدائی نقوش "نکات الشعرا" میں ہر جگہ موجود ہیں ـ آنے والی نسل پر اس کے اثرات کا ڈاکٹر سید عبد اللہ نے بہ طور یوں اظہار کیا ہے ـ

"نکات میں تنقیدی ذوق کی تربیت میں جو نمایاں حصہ لیا اس سے اردو ادب اور شاعروں کو معتد بہ فائدہ پہونچا"۲

۲ـ طبقات الشعرا ـ قدرت اللہ شوق

قدرت اللہ شوق کا تذکرہ "طبقات الشعرا" تقریباً ۱۱۸۸ھ ـ ۱۷۷۴ء میں منظر عام پر آیا اور کئی اعتبار سے یہ اہم اور نایاب تذکروں میں شمار کیا جاتا ہے ـ "طبقات الشعرا" میں بیسا ہ نام ـ سے بھی ظاہر ہوتا ہے مصنف نے شاعروں بالخصوص غزل گویوں کے حالات طبقات میں تقسیم کر کے ان پر تفصیلی بحث کی ہے ـ اس کی انہوں نے اپنے تذکرہ کو دوسرے تذکروں

۱ـ نکات الشعرا مرتبہ مولوی عبد الحق ص ۱۰۸
۲ـ ڈاکٹر سید عبد اللہ ـ شعرائے اردو کے تذکرے ، مکتبہ شعر و ادب دہلی ، ص ۱۰۴

ی تذکرہ سے الٹ کر دیا ہے۔ جب ہم اس تذکرہ پر غور کرتے ہیں تو ہمارے سامنے سب سے پہلے تذکرہ کے نام کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے کیونکہ مصنف نے خود "تکملۃ الشعرا" میں اس کا مختلف کاموں پر کئی ناموں سے یاد کیا ہے۔ کہیں اس کا نام "حقیقت شعرا" اور کہیں "تذکرہ ہندی" رکھا ہے۔ اس کے علاوہ کہیں "طبقات شعرائے ہندی" اور کہیں "بقات الشعرا" لکھا ہے۔ یاد رہے کہ شاید ابتدا میں شوق نے اس کا نام "حقیقت شعرا" رکھ دیا ہو لیکن اس کا کوئی معتبر ثبوت موجود نہیں ہے۔ جس وقت شوق نے اس تذکرہ کو ترتیب دیا اس وقت شعرائے اردو کے تقریباً سات تذکرے موجود تھے جو شوق کے تذکرہ کے ماخذ ہوسکتے تھے لیکن تذکرہ کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان ماخذوں سے بےخبر تھے کیونکہ انھوں نے اپنے تذکرہ میں ان کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ حالانکہ یہ تذکرہ شوق کے علم میں ضرور رہے ہونگے۔

"نکات الشعرا" میں میر نے عام طور سے شاعروں کے بارے میں تعریفی کلمات درج کئے ہیں اور کہیں کہیں لطیف فقرے چست کئے ہیں جنھیں ہم تنقید کا یا تبصرہ کہا جا سکتا ہے۔ "طبقات الشعرا" کے مقدمے سے ظاہر ہوتا ہے کہ شوق نے ریختہ کی جو قسمیں بیان کی ہیں وہ بالکل میر کے "نکات الشعرا" کے ریختہ کے قسموں کی نقل ہے۔ "نکات الشعرا" کی طرح یہ بھی بہ زبان فارسی ہے۔ اس تذکرہ کو پڑھنے سے یہ بات یقینی طور پر سمجھ آتی ہے کہ قائم چاند پوری کا تذکرہ "مخزن نکات" بھی ان کی نظر سے ضرور گزرا ہوگا اور انھوں نے اس سے ہی استفادہ کیا ہوگا مگر اپنے تذکرہ میں چند شعرا کا اضافہ کیا ہے جو کہ "مخزن نکات" میں نہیں ہے مثلاً "طبقات الشعرا" کے طبقہ اول میں امیر خسرو، مرزا عبدالقادر قادرت، عبدالقادر بیدل اور حکیم یونس وغیرہ کا اضافہ کیا ہے۔ طبقہ دوم میں حاتم، نواب الدین ثاقب، یکرو وغیرہ کا اور اس کے طبقہ سوم میں نواب ہدایت علی خان ضمیر اور حسن علی شاہ وغیرہ کا اپنے تذکرہ میں جگہ دی ہے اس

یہ علاوہ اہم شعرا کے بارے میں کم و بیش ایسی ہی باتیں کہی گئی ہیں لیکن بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مصنف نے چند باتوں کا اضافہ بھی کیا ہے مثلاً یہ کہ "طبقات الشعرا" میں شوق نے مرزا مظہر جان جاناں کا ذکر کیا ہے کہ انھوں نے فارسی دیوان چھوڑا بلکہ "مخزن نکات" میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ یہ امر قرین قیاس ہے کہ شوق نے "نکات الشعرا" اور "مخزن نکات" سے ابتدائی تین طبقوں کے حالات اکٹھا کرنے میں مدد لی اور باقی حصے خود تصنیف کئے اس طرح اگر انھوں نے اپنے تذکروں کو طبقات میں تقسیم کرنے کا طریقہ بھی قائم چاند پوری سے لیا ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ نام چاند پوری نے اپنے تذکرے کو تین طبقات میں تقسیم کیا تھا یعنی طبقۂ اول، طبقۂ دوم اور طبقۂ سوم۔ طبقۂ اول میں متقدمین کے بارے میں لکھا ہے۔ طبقۂ دوم میں ایہام گو شعرا ہیں جن میں بہت سے صاحب دیوان بھی ہیں اور طبقۂ سوم میں قائم کے معاصر جو تذکرہ لکھتے وقت بہت زیادہ مشہور تھے غالباً شوق نے بھی اسی طرح اپنے تذکرے کو مختلف طبقات میں تقسیم کر کے اس کو ایک تکمیل تک پہنچایا۔ بہت سی تکنیکی خامیوں کے باوجود یہ تذکرہ مخصوص اہمیت کا حامل ہے۔ "طبقات الشعرا" میں ولی، آبرو، صحفی، ناجی، گردن، مظہر، آرزو، تاباں، رنگین، درد، سوز اور رات وغیرہ جیسے اہم شاعروں کا بیان اور ان کے ہم پلہ بارے میں مختصراً بیان کیا ہے۔ جیسے مظہر کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"جان جان مرزا مظہر متخلص بمظہر مردیست فرشتہ صفت علوی نسبت ہندی

(مولد ..... دیوان فارسی او بہ نظر این احقر گذشتہ"[1]

(مرزا مظہر جان جاناں فرشتہ صفت اور نیک رو تھے۔ اگرچہ انھوں نے ریختہ میں بھی طبع آزمائی کی مگر ان کا فارسی دیوان موجود ہے۔)

خواجہ درد کے بارے میں لکھتے ہیں۔

۱۔ قدرت اللہ شوق، "طبقات الشعرا" مرتبہ نثار احمد فاروقی، ص ۶۱

" مرد پراست فاضل و متورع درویش است صاحب نسبت و نامی عوام دریائے
معرفت و طریقت ..... و مع علوم سخنوری و فنون ماهر و ماهر و
بوئے فقر و صفائی باطن از مذاق گفتار ظاهر "[1]

(خواجہ میر درد ایک درویش صوفی تھے۔ ان کا پورا دیوان اردو میں موجود ہے جو
تصوف پر اشعار سے بھرا ہوا ہے صوفیانہ مزاج ہونے کی وجہ سے تقریباً پورا دیوان
عشق حقیقی کا مظہر ہے)

ابتدا میں تذکرہ نگاری کا رواج اردو زبان میں نہیں تھا اس وجہ سے شوق نے بھی
اپنے تذکرہ فارسی میں لکھ کر ہر دور کے شعرا کی نمائندگی کی ہے۔ مگر حیرت اس بات
پر ہوتی ہے کہ انھوں نے سودا جیسے بڑے شاعر کے بارے میں تفصیل سے کچھ نہیں لکھا۔
اس کے مصنف نے بہت سے شعرا کا ذکر کیا ہے لیکن بہت اختصار کے ساتھ۔ انھوں نے ممتاز اور
مشہور شعرا پر بھی مختصر دو چار سطریں لکھی ہیں۔ چونکہ اس تذکرہ کی طرح اور ترتیب بہت
قدیم مدت میں ہوئی ہے اس لئے ایسے مواد پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی جا سکی مگر اس کے
باوجود اس تاریخی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

شوق نے اپنے تذکرہ کو پانچ مقالوں میں تقسیم کیا ہے اور شعرا کے مختصر حالات اور
انتخاب کلام میں دوسرے تذکروں سے استفادہ کیا ہے ہمعصر شعرا کی غزلوں کا انتخاب ان
کی جانشینوں سے لیا گیا ہے۔ اور تذکرہ کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں
کہ شوق نے کہیں بھی کسی کے شاگرد ہونے کا اعتراف نہیں کیا ہے۔ " طبقات الشعرا " کے مرتب
نثار احمد فاروقی نے اس تذکرہ کی حسب ذیل خصوصیات بیان کی ہیں۔

اس کی پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ اس میں بیشتر ہمعصر شعرا کے کلام کا انتخاب خود
ان شاعروں کے مسودات سے کیا گیا ہے۔ ان میں میر تقی میر بھی شامل ہیں۔

" میر تقی میر .... مصنف تذکرہ شعرائے ہندوستان ..... اکثر سخن
طرازان و معنی یابان مطاورات و روزمرات این فن از ایشان اخذ

---

[1] قدرت اللہ شوق " طبقات الشعرا " ورق ۱۷

نمودہ ۰۰۰۰۰ از مدت بسبب افراط وتفریط روزگار ۰۰۰۰۰ ہمراہ ناگر مل
کے دیوان تن و دخیل بادشاہی بودہ در قلعہ گوالیر محبوس می بودہ
خدا تعالی زندہ دارد "[1]

میر تقی میر کا تعرائیہ اردو مین ان کی اہمیت سے کسی کو انکار نہین ۔ ابتدا سے وہ
بہت پریشان حال اور پھریلو جھڑون سے عاجز تھے لیکن اردو مین غزل پر طبع آزمائی کی اور
اپنا دیوان مرتب کیا ۔

۲۔ "ثانیا" اس تذکرہ مین بیشتر شعرا وہ ہین جو ہمعصر ہین اور علاقہ روہیلکھنڈ خصوصا
رامپور سے تعلق رکھتے ہین ۔ بارہوین صدی ہجری / اٹھارہوین صدی عیسوی) کے نصف آخر مین اس تذکرے
کے رچنا سے رامپور کے علمی و ادبی ماحول کی عکاسی مین بہت مدد ملتی ہے ۔

۳۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ "طبقات الشعرا" بہ اعتبار ترتیب زمانی اردو شاعرون
کا آٹھوان تذکرہ ہے اور طبقاتی تقسیم کی بنیاد پر مرتب ہونے والے تذکرون مین اس کا
دوسرا نمبر ہے ۔ اس سے پہلا تذکرہ جو زمانا" بھی اس سے مقدم ہے ۔[1]

بہرحال ہم خود کو تذکرہ "طبقات الشعرا" سے یکسر منحرف نہین ہوسکتے ۔ اس کی خاص
وجہ یہ ہے کہ یہ تعرائیہ اردو کے تذکرون مین قدیم و نایاب تذکرہ ہے ۔ اس لحاظ سے اس
کی ادبی اور تاریخی اہمیت مسلم ہے اگرچہ اس مین تنقیدی جائزون کی گنجائش نہین مگر
دوسرے تذکرون کی طرح اس تصنیف مین بھی تنقید کے ابتدائی نقوش ملتے ہین ۔

ق۔ تذکرہ ہندی ۔۔ غلام ہمدانی مصحفی ۔

مصحفی کا تذکرہ ایک حد تک دبستان میر سے متعلق ہے اور اس مین "نکات الشعرا"
کے اثرات بھی پائے جاتے ہین لیکن مولف نے کہین بھی میر کا ذکر نہین کیا ہے ۔ اس کتاب کی
سن تصنیف ۱۲۰۹ھ ، ۱۷۹۴ء ہے یعنی یہ کتاب اٹھارہوین صدی کی آخری دہائی کے اوائل

۱۔ قدرت اللہ قاری ، "طبقات الشعرا" مرتبہ نثار احمد فاروقی ، ص ۴۲ ، ۴۳

مین ایج ہوئی ۔ اس مین عہد محمد شاہ سے لے کر شاہ عالم ثانی کے دور تک اردو شعرا
باحدود غزل گویون کے حالات قلم بند ہین ۔ " تذکرہ ہندی " جن مین غزل گویون کے کلام
پر تبصرہ اور ان کا انتخاب درج ہے ان مین شاہ مبارک ، عبدالحی تاباں ، قلندر بخش جرات ،
جعفر علی حسرت ، خواجہ میر درد ، میر مہدی داغ ، سعادت یار خان رنگین ، مرزا رفیع سودا
مرزا مظہر ، میر تقی میر ، مصحفی ، ناسخ ، انعام اللہ خان یقین اور مصطفیٰ خان یکرنگ
اہم ہین ۔ سودا کے متعلق وہ لکھتے ہین ۔

" مرزا رفیع محمد رفیع المتخلص بہ سودا پسر مرزا محمد شفیع کابلی ہے
در عصر خویش سرآمد شعرائے ریختہ گو گذشتہ ، بعضے اورا درین فن
بہ ملا الشعرائی نسبت می نمایند "[1]

(مرزا محمد رفیع سودا قصیدہ نگاری مین خاص اہمیت کا حامل ہین اس لیے قصیدہ اور خاص کر
سہرا سے بہت شہرت حاصل کی ۔ ملا الشعرائی کا تاج قصیدہ نگاری کی وجہ سے نصیب ہوا)۔
مظہر کے بارے وہ لکھتے ہین ۔

" مرزا جان جان مظہر تخلص کہ پیر از مشائخ کبار گذشتہ ۔ چند غزلیات
متعدد از خامہ فکرش بر صفحہ کاغذ ریختہ بود ند کہ مشار الیہ مانع
آمدہ ۔ آخر ایشان قرار شعر گفتن خود بر زبان فارسی دارند "[2]

(مرزا جان جان مظہر نے ابتدا مین غزل ، طبع آزمائی کی لیکن ان کو شہرت فارسی کی وجہ
سے نصیب ہوئی کیونکہ ان کا مختصر دیوان فارسی زبان مین موجود ہے)

میر تقی میر کے بارے وہ لکھتے ہین ۔

" میر تقی میر کہ مفصل احوال ایشان نیز در تذکرہ فارسی سمت تحریر
یافتہ ۔ اگرچہ دیوان فارسی ہم دارد اما در فارسی گویان شمردہ

۱۔ غلام ہمدانی مصحفی ، تذکرہ ہندی ، مرتبہ مولوی عبدالحق ، ص ۱۲۵
۲۔ ایضاً ، ص ۳۳

نمی بود ۔ چار دیوان ریختہ از خامۂ فکر ریختہ و مثنویہا نیز متعدد (میر تقی میر کا شمار اردو کے اہم شاعروں میں ہوتا ہے ۔ ان کا ایک دیوان فارسی میں موجود ہے لیکن ان کا اردو دیوان خاص اہمیت کا حامل ہے)۔

اس دور کے مروجہ تنقیدی رجحانات کے پیش نظر صحفی بھی شاعروں کے کلام پر مدلل یا مدلل رائے نہیں پیش کرتے ۔ ان کے تذکروں میں بیان اور تبصرہ کو خاص اہمیت ہے ۔ تنقیدی رنگ بہت کم ملتی ہے کچھ شاعروں مثلاً سودا پر صحفی کا تبصرہ بہت مختصر ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ کچھ لکھا ہے وہ اتنی کہ وقیع اور اہم ہے ۔ "تذکرہ ہندی" سے ہم اردو کے پہلے معیار اور تنقیدی رجحان کا کچھ پتہ لگاتے ہیں لیکن غزل میں جو نئے عناصر اس دور میں تھے ان کا کہیں ذکر نہیں ملتا ۔

"تذکرہ ہندی" اگرچہ "نکات الشعرا" کے پایہ کی تصنیف نہیں ہے لیکن اردو غزل کے اکابرین اور میر کے بیان سے نہیں اکثر تھے بیان موجود ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ میر کے دور کے جو دستاویزی مواد موجود ہے اس میں دونوں تصانیف کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔

۴۔ گلشن ہند ۔ مرزا علی لطف بہ لطف

یہ کتاب جان گلکرسٹ کی تحریک پر ۱۲۱۵ھ ۔ ۱۸۰۰ء میں مرتب کی گئی اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ شعرائے اردو کا پہلا بہ زبان اردو تذکرہ ہے ۔ اس تذکرہ میں یہ بات بھی ذکر ہے کہ "گلشن ہند" ۱۷۸۴ء میں لکھی ہوئی کتاب "گلزار ابراہیم" کا اضافہ ہے اور فورٹ ولیم کالج کی اہم تصانیف میں اس کا خاص مقام ہے ۔ تنقیدی اعتبار سے اردو شاعری یا غزل کے فن اور غزل گویوں پر اس کتاب سے ہماری معلومات میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوتا ۔ سرسری بیان روایتی اصطلاحات کی روشنی میں شاعروں کے کلام کا جائزہ اس دور کے تنقیدی مزاج کی عکاسی کرتا ہے ۔ کہیں کہیں غیر ضروری اور مہمل اعتراضات بھی اثر پذیر ہیں جس سے مولف کے مذہبی خیالات، ادبی گروہ بندی اور عصبیت کا پتہ چلتا ہے ۔

۱۔ غلام ہمدانی مصحفی، تذکرہ ہندی، مرتبہ مولوی عبدالحق، ص ۲۰۴

" گلشن ہند " میں آرزو ، آبرو ، احسن ، انشا ، افسوس ، تاباں ، حاتم ، درد ، سودا ، میر ، مصحفی ، مظہر ، ولی ، یقین ، یکرنگ اور یکرو جیسے شاعروں کا مختصر بلیغ بیان اور انتخاب ہے۔ بقول لطف میر تقی میر نے " تازگی مضمون اور فنی لطافتوں سے ریختہ کو آراستہ کیا ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے اردو میں ان الفاظ کا استعمال کیا ہے۔

سودا " آنکھ کے معنی بیگانہ اور مضمون تازہ پیدا کرنے میں یگانہ تھے " ۔ درد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ " دیوان ان کا بہت مختصر ہے لیکن سراپا درد و اثر ہے "۔

۵۔ گلشن بے خار ۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

مرزا کے اردو کے معروف تذکرہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا تذکرہ " گلشن بے خار " ہے۔ یہ ۱۲۴۸ھ ۔ ۱۸۳۳ء سے شروع ہوکر ۱۲۵۰ھ ۔ ۱۸۳۵ء میں مکمل ہوا ۔ یہ تذکرہ بڑی تقطیع پر تقریباً " بارہ سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور اس میں تقریباً " آٹھ سو شاعروں کے حالات درج ہیں۔ شیفتہ غالب اور مومن کے ہمعصر تھے ان کو اردو اور فارسی دونوں سے یکساں لگاؤ تھا اور وہ دونوں زبانوں میں فکر سخن بھی کرتے تھے ۔ ان کے یہاں شعری مذاق کے ساتھ علمی سنجیدگی اور محققانہ متانت بھی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ " گلشن بے خار " کے تبصرے بھی اپنی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس تالیف میں شیفتہ نے اٹھارویں صدی کے مشہور و معروف شعرا کا ہی ذکر کیا ہے کہ لیکن انیسویں صدی کے ابتدائی نصف حصہ میں اکثر و بیشتر اہم شاعروں کا بھی ذکر ہے جن کے نام ادبی تاریخ کی کتابوں میں بھی نہیں ملتا ۔ اس میں شک نہیں کہ " گلشن بے خار " کے مولف نے اپنے پیشروؤں کے مقابلے میں زیادہ ذمہ داری اور علمی لگاؤ کا ثبوت دیا ہے۔ شاعروں کے حالات اور کلام پر تنقید بھی بہت حد تک کسی دیدہ ذہن کی غمازی کرتا ہے۔ غزل کو شاعروں پر شیفتہ کی رائیں نہایت وقیع اور قابل غور

ہیں۔ متاخرین اور شیفتہ نے میر کی غزلوں کو ان کے قصیدوں سے بہت بہتر مانا ہے۔ اس رائے سے آج بھی ناقدین متفق ہیں۔ اس کے سوا کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہ قصیدے میں جو وہ دکھاتے ہیں وہ ان کی غزلوں میں مفقود ہے۔ شیفتہ نے سودا کی غزلوں اور قصیدوں کا تقابلی مطالعہ کر کے ان کی قدر و قیمت واضح کی ہے۔ سودا کے متعلق لکھتے ہیں

"حلاوت کلام حاتمی نوشی لب کرین اعدان بہرین مماثل میدارد و فکر سخن نتاست کہ طبہائے کم نجیدہ ازان می خیزد"[1]

مرزا رفیع سودا بہترین قصیدہ گو، خوش ذہن اور دانشور تھے۔ فن قصیدہ گوئی میں بے نظیر روزگار اور شہرت میں بے نیاز تھے وہ اس دور کے سب سے بڑے معنی سرور یعنی پامال راستے سے ہٹ کر نیا راستہ اختیار کرنے والے تھے)۔

دوسرے چند شعرا کے متعلق ان کے فرمودات ایک غور ہیں۔

قائم ـــ "در قطعات و رباعیات مضامینے دہ دلالت بر خوش فکری کند از بعض تراد یدہ"[2]

مصحفی ـ "گزیدہ اشعار او در نہایت رتبہ والا و مرتبہ عالی است"[3]

ممنون ـــ "طرز گفتار خیلے دلچسپ و دلنشین است و صحت کلام نہایت عذب و شیرین و در بستن مضامین بیگانہ یگانہ است"[4]

تاباں ـــ "چون روئے خوش طبع خویش داشت"[5]

جان ـــ "حدیث شیرین و دلاویز سخنش ملک نمکین و خوانکیز"[6]

غالب کے متعلق لکھتے ہیں ـــ

"گوئی بسند پرواز چمن معانی است و بلبل نغمہ پرواز گلشن ہوا بیانی و بہ بلندی خیالش او فلک پستی زمین است"[7]

۱۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ، گلزار بیخار، ص ۹۹۔
۲۔ ایضاً، ص ۱۵۳ ۳۔ ایضاً، ص ۱۷۸
۴۔ ایضاً، ص ۱۸۷ ۵۔ ایضاً، ص ۳۸
۶۔ ایضاً، ص ۳۷ ۷۔ ایضاً، ص ۱۳۹

ان کا خیال ہے کہ اگر غالب کی رنگارنگ خصوصیت کو دیکھنا ہے تو ان کی اردو اور فارسی شاعری دونوں کا مطالعہ کرنا ازحد ضروری ہے۔ کیونکہ وہ بہ یک وقت اردو و فارسی دونوں میں ماہر تھے۔ طرز ادا، جدت طرازی اور نازک خیالی ان کے کلام کا خاصہ ہے)۔

ذوق پر تبصرہ بھی دلچسپ ہے اور آب حیات میں آزاد کی یاد دلاتا ہے۔

"ذوق المخاطب بالسانی ہندی آئینہ طوطی بلاغت است و طوطی عکرستان فصاحت امہ سحر بیانی ببالایہ راست و دامن آتش زبانی از باد نفس شعلہ افزا است"۔[1]

(خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق کی قصیدہ نگاری کی تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کی قصیدہ نگاری میں فصاحت و بلاغت کا عنصر موجود ہے انہوں نے بہت سے قصیدے بھی لکھے)۔

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ اردو شاعری بالخصوص غزل پر فارسی و اردو زبان میں لکھے گئے یہ تذکرے بہت حد تک تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں تنقیدی مواد کم ہی ملتا ہے۔ شاعروں کے انتخاب سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مولفین مذہبی، دبستانی یا دوسرے تعصبات سے بے نیاز نہیں تھے۔ غزل کی تنقید میں عموماً روانی، سلاست و فصاحت، تشبیہات و استعارات اور اس قسم کے خارجی محاسن پر زور دیا گیا ہے۔ کہیں کہیں تقابلی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ موضوعی طور پر ہمیں ان تذکروں سے اردو غزل کی تنقید مرتب کرنے کے لئے کچھ خام مواد ضرور ہاتھ آجاتا ہے۔ لیکن دیدہ تنقید نے غزل کی افہام و تفہیم، تحسین و تنقید، تشریح و توضیح کے پہلو نکالے ہیں وہ ان میں بہت حد تک ناپید ہیں۔

۱۔ نواب مدد گیر خان بیفتہ، گلشن بے خار، ص ۷۴

مولوی محمد حسین آزاد اور "آب حیات"

اردو تنقید بالخصوص غزل کی تنقید کے ابتدائی نقوش تذکروں میں جا بجا ملتے ہیں لیکن اردو شاعروں کا مدلل جائزہ پہلی دفعہ آزاد کی "آب حیات" کے ذریعے منظر عام پر آیا۔ "آب حیات" اپنے لحاظ سے تذکروں کی تنقید کی آخری کڑی ہے اور دوسرے لحاظ سے شعری تنقید کی طرف پہلا قدم ہے۔ آزاد نے اپنے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اردو غزل کا مخصوص انداز سے جائزہ لیا ہے اور اس کے دور بہ دور ارتقاء پر بحث کی ہے۔ متقدمین سے لے کر متاخرین تک انھوں نے تمام اہم غزل گویوں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے ان مشاہیر کی شخصیت اور شعری کردار کو بھی ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ "آب حیات" اردو میں پہلی بار ادبی تاریخ، ابتدائی شعری تنقید اور شعراء کے متعلق لطائف و واقعات کا مجموعہ ہے۔

"آب حیات" کے اعتبار سے آزاد کی شاہکار تصنیف ہے جو حالی کی "مقدمہ شعر و شاعری" کے دس سال پہلے یعنی ۱۸۸۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب غدر کے بعد انگریز حکومت ہندوستان پر پوری طرح مسلط ہو چکی تھی۔ انگریزی تعلیم اور مغربی کلچر کے اثرات رفتہ رفتہ ہندوستانی تعلیمی اداروں اور معاشرے میں محسوس کئے جا سکتے تھے۔ انگریز شاعر میتھو آرنلڈ کے بقول "یہ وہ زمانہ تھا جب ایک دنیا مر چکی تھی مگر دوسری پیدا نہیں ہوئی تھی"۔

معاشرے کے اس زوال کے بعد پرانی قدریں تیزی سے بدل رہی تھیں ادب اور دوسرے علوم پر بھی انگریزی ادب کا اثر نمایاں تھا۔ ہندوستانی ادب میں انیسویں صدی کے اوائل سے ہی انگریزی ادب سے استفادہ کیا جانے لگا تھا لیکن اردو ادب میں سرسید کے پہلے اس کا شعور نہیں تھا۔ اسے سرسید نے پہلی دفعہ ادب بالخصوص شاعری کو افادی رخ دیا

اثر ہ ان کا خاص میدان تعلیمی اصلاح تھا لیکن انھوں نے اردو ادب کی سمت متعین کر دی۔
اس پر آزاد اور حالی دونوں سرسید کی تحریک سے متاثر ہوئے۔ حالی کی تصنیف "مقدمہ
شعر و شاعری" ایک طرح سے سرسید کی تحریک کا ادبی منشور کہا جا سکتا ہے۔
آزاد اگرچہ بہت حد تک پنجاب میں قیام کے دوران کرنل ہالرائیڈ سے متاثر رہے لیکن ان
کے اندر بھی وہی جذبہ کام کر رہا تھا کہ اردو ادب بالخصوص شاعری اور تنقید کو
انگریزی نہج پر لانا چاہئے۔ اس لحاظ سے "آبِ حیات" ان کا عظیم کارنامہ ہے۔

"آبِ حیات" اردو شاعری بالخصوص غزل کے شاعروں کا قاموسی جائزہ ہے۔ جس میں
ہر عہد کی زبان اور شعری خصوصیات تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ مشاہیر پر تبصرہ
سادہ انداز میں کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ہمارے سامنے ان کی بولتی تصویریں آ رہی ہیں۔ آزاد
کا مطمح نظر بالکل واضح تھا۔ وہ اردو ادب کے شعری سرمایہ کی اہمیت جتانا چاہتے تھے
تو دوسری طرف متوسلین و معاصرین کی شعری خدمات کے بھی قدردان تھے۔ انھوں نے
نہ صرف اردو شعر و ادب کی تاریخ لکھنے پر دوسروں کی راہ نمائی کی بلکہ قدیم شاعری
کے دفینے بھی پیدا کر کے تحقیق بالخصوص لسانی تحقیق کی طرف مائل کیا۔ "آبِ حیات"
میں آزاد کی انشا پردازی بدرجہ کمال نظر آتی ہے۔ ان کی رنگین بیانی کے باعث
اس کو پڑھنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ آزاد کے سب سے پہلے اردو کے غزل کی نقادی کی طرف
توجہ دی گئی۔ ان کے بقول اگر کسی شاعر کی نو تصنیف شاعر کے قریب ہوتا ہے تو غزل میں
اس رسمی و روایتی انداز بیان کو ترک کرنا ضروری ہے۔ غزل کے افادی اور اخلاقی
حیثیتوں پر آزاد کے اس مدلل تنقید نہیں کی گئی حالی کے یہاں نہیں یہ بات بالکل
واضح ہے وہ بھی شاعر کو محض تفریح طبع کا ذریعہ بنانا نہیں چاہتے تھے۔
پروفیسر مسعود حسن رضوی کا قول ہے کہ۔

"آبِ حیات" ایک طرف اردو شاعری کے ارتقاء کی تاریخ پیش کرتی ہے
تو دوسری طرف ہمارے شاعری بالخصوص اس کے علمی و ادبی پہلو کا ایک

مکمل نقد کہا تی ہے جس کی نظیر کوئی دوسری تصنیف پیش نہیں کرسکتی
عربی تنقید کی حد تک اگرچہ آزاد نے جمالیاتی پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کیا ہے لیکن اس
صنف کی مقبولیت کے پیش نظر انھوں نے معاشرتی اثرات کو بھی نمایاں کیا ہے۔

نقادوں نے "آبحیات" میں آزاد کی انداز پردازی، رنگین بیانی اور تاثراتی
انداز بیان کو "علمی تاثیر" سے تعبیر کیا ہے۔ سید وقار عظیم نے اپنے مضمون "تنقید
آزاد اور اس کا مخصوص مزاج" میں اسے مخصوص رنگ کہا ہے جو ان کے نزدیک آزاد کی معرفت
کی بدولت ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ "آبحیات" کے ہر صفحہ پر آزاد کی شخصیت،
ان کی انداز پردازی اور مخصوص سوز نگارش کی چھاپ نظر آتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں
ایک حد تک روایتی رنگ بھی شامل ہے۔ آزاد نے اپنے پیشروؤں کی تنقید سے بھی استفادہ کیا ہے
اور دوسری طرف اپنے معاصرین سے بھی متاثر ہوئے ہیں۔ سید وقار عظیم کا قول ہے کہ

"آزاد کا تذکرہ "آبحیات" اس مشرقی مزاج کا بے نظیر اور بے مثال
آئینہ ہے لیکن تنقید کے مشرقی مزاج اور اس مزاج کی جملہ لطافتوں اور
نزاکتوں کا آئینہ ہونے کے باوجود اردو شاعری کا پہلا منظم، مربوط اور
بہت سی حیثیتوں سے شائستہ تذکرہ ہے۔ میں ماحول، شخصیت اور تخلیق کے
باہمی اور ذاتی رشتے کی اہمیت محسوس کرکے پہلی مرتبہ شائستہ تنقید
کی انداز عملی طور پر متعین اور واضح کی گئی ہے۔ جہاں پہلی مرتبہ
جہاں اور بیان کے تاثر کے تعلق میں دونوں کے صحیح مقام اور حیثیت کی
صراحت کی گئی ہے۔"[۲]

اس بات پر تو تقریباً تمام نقاد متفق ہیں کہ "آبحیات" کی حیثیت اردو تنقید میں
تاریخی اعتبار سے اور عملی تنقید کی حد تک ایک سنگ میل کی ہے۔ مشہور انگریزی نقاد

۱۔ پروفیسر مسعود حسین رضوی، "آبحیات کا تنقیدی مطالعہ"، ص ۱۷، مکتبہ
۲۔ تنقید آزاد اور اس کا مخصوص مزاج، سید وقار عظیم،
آبحیات کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ، مرتبہ سید سادات ۔۔۔ ۱ ۔۔۔ ۲

ڈاکٹر جانسن کے تنقیدی شاہکار "LIVES OF POETS" کی جو حیثیت انگریزی میں ہے۔ اس پایہ کی اردو میں اگر کوئی تصنیف ہے تو وہ "آبِ حیات" ہے۔

"آبِ حیات" جس نوع کی تصنیف ہے اس پر بلند ہو کر اصولوں سے بحث نہیں کی جا سکتی اگرچہ اس میں تذکرہ نگاری اور بیانیہ اسلوب کا رنگ غالب ہے لیکن درحقیقت یہ ادبی تذکروں اور ادبی تاریخوں سے منفرد نوعیت رکھتی ہے۔ احسن فاروقی نے اپنے مضمون "تذکرہ نگاری اور محمد حسین آزاد کی آبِ حیات" میں یہ نظریہ قائم کر لیا ہے کہ "آبِ حیات کی بنیاد تمامتر تذکرہ نگاری پر قائم ہے"[1] یہ بات تو صحیح ہے کہ آزاد نے میر تقی میر اور دوسرے تذکرہ نگاروں سے استفادہ کیا اور فارسی و اردو تذکرہ نگاروں کو انہوں نے اپنے سامنے نمونہ رکھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ "آبِ حیات" تو تذکرہ نہیں آزاد کے ساتھ یہ ناانصافی اور تنقید کی دھاندھلی ہے۔ ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ انیسویں صدی کے آخر میں یورپ بالخصوص انگلستان میں ایسی تنقیدی کتابیں لکھی جا چکی تھیں جو شعر و ادب کے تجزیے سائنٹی تحقیق اور سائنسی تنقید کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ آزاد جرمن اور فرانسیسی تنقید تو درکنار انگریزی نقادوں مثلاً کولرج اور آرنلڈ کی تصانیف سے بھی واقف نہیں تھے۔ لیکن "آبِ حیات" میں انہوں نے اس بات کی کوشش کی اکثر موقعوں پر فرد کی ہے کہ اردو شاعری بالخصوص غزل زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ "آبِ حیات" میں ادوار کی تقسیم، شعراء کے کلام کی خصوصیات اور غزلوں کے نمونے اگرچہ قدیم طرز تحریر کی یاد دلاتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس طرز پر لکھتے ہوئے بھی وہ زمانے کے نئے تقاضوں اور روحِ عصر سے بے خبر نہیں تھے۔ تذکروں کے انداز میں لکھتے ہوئے بھی وہ ان پڑھنے والوں کو بھی اپنے دائرۂ اثر میں لینا چاہتے تھے۔ ان کے دماغوں میں انگریزی لالٹینوں کی روشنی پہنچ چکی تھی لہٰذا احسن فاروقی کا یہ خیال کہ "آبِ حیات" تمامتر تذکرہ نگاری کی بنیادوں پر قائم ہے"

۱۔ تذکرہ نگاری اور محمد حسین آزاد کی آبِ حیات، احسن فاروقی، آبِ حیات کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ مرتبہ سید سجاد ۔ ص ۴۲ ۔۔ ۴۶

کچھ زیادہ قابل لحاظ نہیں ہے۔

"آب حیات" میں آزاد کی مختلف ذہنی صلاحیتیں نمایاں ہیں ۔ وہ بہ یک وقت ادیب مورخ، لسانی محقق، سیرت نگار، نقاد، مرقع نگار اور انشا پرداز کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ وہ اردو شاعری بالخصوص غزل کو اہم ترین قومی سرمایہ سمجھتے ہیں ان کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ قدیم شاعروں کے کلام اور حالات زندگی امتداد زمانہ سے محفوظ نہیں رہ سکتے لہذا انہوں نے "آب حیات" میں ان بزرگوں و مشاہیر کو حیات جاوداں بخشی اور اس سلسلے کو آگے بڑھا کر متاخرین یعنی اپنے ہم عصر شعراء تک کو شامل کر لیا ۔ یہ بحث/فضول ہے کہ "آب حیات" تاریخ ہے یا تذکرہ یا تنقید ۔ اس میں ان تمام اصناف کی خوبیاں موجود ہیں اور اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے۔ بیسویں صدی کا مورخ یا نقاد اس میں بہت سے نقائص نکال سکتا ہے ۔ لیکن "آب حیات" میں غزل کو مشاہیر کا و علیم الشان بلوس نظر آتا ہے وہ آزاد ہی کے قلم سے وجود معرض وجود میں آسکا ۔

تذکرہ نگاری فارسی ادب کا جزو لاینفک ہے۔ فارسی زبان و ادب سے متقدمین نے ہماری اصناف بالخصوص غزل، قصیدہ اور مثنوی وغیرہ سے استفادہ کیا وہاں تذکرہ نگاری کے نمونوں کو بھی اپنے لئے مشعل راہ بنایا ۔ ان تذکروں میں شاعر کے حالات زندگی اور اس کے کلام پر مختصر رائے زنی ہوتی ہے ۔ خصوصیات کلام کی وضاحت کے لئے کلام کے نمونے بھی دئے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی معاصرانہ چشمک اور ادبی معرکوں کا بھی ذکر ہوتا ہے لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تذکرہ نویسی اپنے زور قلم سے اس محصور دور کے شاعروں کو زندہ کرنا چاہتا ہے جس کا اس نے انتخاب کیا ہے ۔ آزاد فارسی ادب کے متبحر عالم تھے اور انہوں نے لازمی طور پر فارسی تذکرہ نگاروں سے استفادہ کیا لیکن "آب حیات" پر ان کی شخصیت کی زبردست چھاپ ہے ۔ یہ کہنا مشکل ہوجاتا ہے کہ آزاد اس تصنیف میں مشاہیر کے تذکروں سے ہمیں [illegible] مخطوط تحریر ہیں یا شعری ادبی داستان سنا رہے ہیں ۔ ولی سے لے کر غالب تک شاعروں کا سو دربار انہوں نے سجایا ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ جدید

تنقید ۔ تنقیدات کی روشنی میں آزاد کے نقادانہ شان کا اندازہ ہی بہت آسان ہے لیکن اگر انصاف سے کام لیا جائے تو کہنا پڑے گا کہ وہ اس صنف کے بہت بڑے فنکار ہیں ۔ انھوں نے جو ادوار شاعر پائے ہیں وہ تحقیق کی روشنی میں مستند نہیں ہیں مگر ان کی تنقید اب تک قائم ہے ۔ سوانحی حصے میں شاعروں کے حالات زندگی ، افتاد طبع ، دربار سے تعلق ، سرپرستوں اور مربیوں کے اثرات ، شاعروں کی باہمی چشمک اور چونچلوں کے تذکرے ملتے ہیں ۔ بہت حد تک ان کا ذکر تاثراتی ، اسلوب نگارش میں وجدانی اور تاثراتی رنگ لگتا ہے ۔ انیس ناگی نے اپنے مضمون " آب حیات شہرت عام و بقائے دوام " میں لکھا ہے کہ

" آزاد بنیادی طور پر شاعرانہ افتاد طبع رکھتے تھے ۔ ان کا ذہن خیال کے منطقی تسلسل اور ارتقاء کی کمتر صلاحیت رکھتا تھا ۔ اس باعث آب حیات میں تحقیقی و تنقیدی حصہ ان کی تحریر کا کمزور ترین حصہ ہے ۔ تحقیق و تنقید جس تجزیاتی انداز کا مطالبہ کرتی ہے وہ آزاد کے یہاں نہیں ہے ۔ آزاد اپنے تجربات اور جذبات کو حس اور تاثراتی انداز میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں "۔[1]

یہ حقیقت ہے کہ آزاد ایک شاعر کا دل و دماغ رکھتے تھے لیکن وہ اردو کے نثری دور میں پیدا ہوئے لہذا ان کی شاعرانہ جوہر طبع " آب حیات " کی نثر میں نمایاں ہے ۔ اس میں شبہ نہیں کہ " آب حیات " اردو غزل کا سدا بہار زعفران زار ہے ۔

" آب حیات " کے دیباچے میں آزاد نے زبان اردو کے ارتقاء پر بحث کرتے ہوئے ان بانیان شاعروں اور فنکاروں کا ذکر کیا ہے جن کی بدولت اردو شاعری انیسویں صدی کے آخر تک معراج کمال کو پہنچ گئی ۔ ان شاعروں میں غزل گویوں کی اکثریت ہے ۔ آزاد کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ ان کی تصنیف مغربی تنقید سے مقابلہ نہیں کر سکتی ۔۔۔

" نئی تعلیم یافتہ جن کے دماغوں میں انگریزی لائبریوں سے روشنی پہنچی ہے

۱۔ " آب حیات " شہرت عام و بقائے دوام ، انیس ناگی ،
آب حیات کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ ، مرتبہ سید سجاد ، ص ۹۵

وہ ہمارے تذکروں کے اس نقص پر حرف رکھتے ہیں کہ ان سے نہ کسی شاعر کی زندگی کی کیفیت کا حال معلوم ہوتا ہے نہ اس کی طبیعت اور عادات و اطوار کا حال کھلتا ہے نہ اس کے کلام کی خوبی اور صحت و سقم کی کیفیت کھلتی ہے نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معاصروں میں اور اس کے کلام میں کن کن باتوں میں کیا نسبت تھی "۔[1]

شاعر ہے آزاد کا مقصد اردو شاعری کی تنقیدی تاریخ لکھنا نہیں بلکہ مشاہیر کی زندگی ان کے ماحول، شوخیٔ طبع اور ان کی گہری دماغیوں کو ان کے کلام کے پس منظر میں پیش کرنا تھا۔ وہ خود کہتے ہیں کہ جن باکمالوں کے نام امتداد زمانہ سے دھندلے پڑتے جا رہے تھے انہیں وہ دوبارہ زندگی دینا چاہتے تھے۔

" مجھ پر واجب ہوگیا کہ جو حالات ان بزرگوں کے معلوم ہیں یا مختلف تذکروں میں متفرق مذکور ہیں انہیں جمع کرکے ایک جگہ لکھوں اور جہاں تک ممکن ہو اس طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی چالتی پھرتی چلتی تصویریں سامنے آن کھڑی ہوں اور انہیں حیات جاودان حاصل ہوں۔ الحمد للہ کہ چند روز میں جس قدر پریشان خیالات تھے بہ ترتیب جمع ہوگئے۔ اس واسطے اس مجموعہ کا نام "آب حیات" رکھا "۔[2]

" آب حیات " کے ابتدائی ابواب زبان اردو کی تاریخ اور نظم اردو کی تاریخ پر مشتمل ہیں۔ ہمارے موضوع کے اعتبار سے نظم اردو کی تاریخ ایک حد تک اہم ہے۔ اس لئے کہ آزاد نے بھی اعلیٰ شاعری کا معیار فطری شاعری قرار دیا ہے۔ اردو غزل کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ امیر خسرو کے دور میں جو طبع اور ہنگامۂ ایجاد سے ایک تازہ ایجاد ہوا۔ اس میں بقول ان کے تین باتیں قابل لحاظ ہیں ــــ

۱۔ آب حیات مولوی محمد حسین آزاد ص ۳ ــ ۴
۲۔ ایضاً ص ۴

۱۔ مضامین عاشقانہ سے وہ سلسلہ اشعار کا ہمارے یہاں آیا جسے غزل کہتے ہیں وہی قافیے ردیف اور قافیے دونوں کی پابندی اس طرح اور مطلع یا کئی مطلع پھر چند شعر آخیر میں مقطع اور اسی طرح ۔۔۔۔۔

۲۔ عروض فارسی نے پہلا قدم ہندوستان میں رکھا ۔

۳۔ فارسی اور بھاشا کو نوں میں کی طرح اس انداز سے ملایا ہے کہ زبان پر چٹخارہ دیتی ہے ۔ اس میں یہ بات سب سے زیادہ قابل لحاظ ہے کہ انھوں نے بنیاد عشق کی عورت ہی کی طرف قائم کی تھی جو کہ خاصہ نظم ہندی کا ہے ۔[1]

یہ امر قابل غور ہے کہ آزاد کو انیسویں صدی کے اواخر میں ہی اردو شاعری کی زبوں حالی اور ہم ماندگی اور روایت پرستی کا شدت سے احساس تھا چنانچہ نظم اردو کی تاریخ کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ

" یہ اظہار قابل افسوس ہے کہ ہماری شاعری چند معمولی مطالب کے پھندوں میں پھنس گئی ہے یعنی مضامین عاشقانہ ، سیر خواری مستانہ ، سیر گل و گلزارہ وہی رنگ و بو کا پیدا کرنا ہجر کی مصیبت کا رونا ۔ وصل موہوم پر خوش ہونا ۔ دنیا سے بیزاری ، اس میں فلک کی جفا کاری اور غضب یہ کہ اگر کوئی اصلی ماجرہ بیان کرنا چاہتے ہیں تو یہی خیال استعاروں میں ادا کرتے ہیں ۔ نتیجہ جس کا یہ کہ کچھ نہیں کرتے ہیں ۔ میرے دوستو ۔۔۔ دیکھتا ہوں کہ علوم و فنون کا عجائب خانہ کھلا ہے اور ہر قوم اپنے اپنے فن انشا کی دستکاریاں سجائے ہوئے ہے ۔ کیا شرم نہیں آتا کہ ہماری زبان کس درجہ پر کھڑی ہے ؟ ہاں صاحب نظر آتا ہے کہ یا انداز میں کھڑی ہے "۔[2]

حالی نے " مقدمہ شعر و شاعری " میں انھیں خیالات کو شرح و بسط سے بیان کیا ہے ۔ مقدمہ ان

۱۔ آب حیات ، ص ۳۲ ، ۳۳
۲۔ ایضاً ، ۷۷

دونوں بزرگوں کا اردو شاعری بالخصوص غزل کی اصلاح و تنقید ہے۔

آزاد نے اردو شاعری کے پانچ ادوار قائم کئے ہیں۔ یہ سلسلہ ولی دکھنی سے شروع ہوکر غالب دہلوی پر ختم ہوجاتا ہے۔ شاعر شاعروں میں غزل گویوں کی نمایاں اکثریت ہے لہذا معاصر مورخوں کی مناسبت سے آبحیات کا دور بہ دور جائزہ ضروری ہے۔ "آبحیات" کا پہلا دور بقول آزاد کے تمام اردو کے عالم کا پہلا نوروز ہے۔ اس دور میں ولی دکھنی کی غزل خوانی کا اثر حرارت برقی کی طرح دل دل میں دوڑ گیا اور گھر گھر شاعری کا چرچا ہونے لگا۔ اس عہد کے شاعروں میں ولی دکھنی کے علاوہ شاہ مبارک آبرو، شیخ شرف الدین مضمون، محمد باقر ناجی، محمد احسن احسن، غلام مصطفیٰ خاں یکرنگ خاص ہیں۔ ان شعرائے کرام کی غزلیہ شاعری کے متعلق آزاد کا مجموعی فیصلہ کچھ یوں ہے۔

"ان بزرگوں کے کلام میں تکلف نہیں جو کچھ سامنے آنکھوں کے دیکھتے ہیں اور اس سے دل میں خیالات گزرتے ہیں وہی زبان سے کہہ دیتے ہیں۔ ایسے بھی کے خیال، دور دور کی تشبیہیں، ناز استعارے نہیں بولتے۔ اس واسطے اشعار بھی صاف اور بے تکلف ہیں"[1]

آزاد نے ولی کو اردو شاعری کا باوا آدم مانا ہے۔ وہ ایسے بندہ انھیں "تمام اردو کی نسل کا آدم" اور ایسے جملہ "بنی نوع شعرا کا آدم" کہا ہے۔ اس لحاظ سے انھوں نے ولی کو اردو شاعری کا پہلا شاعر مانا ہے اور بعد میں آنے والے شاعروں کو ان کی اولاد معنوی قرار دیا ہے۔ معترضین کہتے ہیں کہ ولی کا وطن گجرات میں نہیں بلکہ اورنگ آباد میں ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ولی سے پہلے دکن میں بہت سے اردو شاعر گزر چکے تھے اور آزاد کو ان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ جغرافیائی اعتبار سے گجراتی اور دکنی میں فرق ہے لیکن گجرات اور اورنگ آباد کی زبان تمام ہند کی اردو سے یقیناً مختلف تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ آزاد نے دکنی یا ریختہ یا اردو کا فرق ذہن میں رکھ کر اردو کا پہلا شاعر قرار

۱۔ "آبحیات" ص ۸۲

دیا ہے۔ ولی ان کے نزدیک اردو میں وہی حیثیت رکھتے ہیں جو انگریزی میں چوسر کی یا فارسی میں رودکی کو حاصل ہے۔ ان کی بدولت اردو میں فارسی کی تمام بحریں آگئیں اور انھوں نے غزل کو قافیہ ردیف سے سجایا اور ردیف وار دیوان بنایا۔ آزاد کا یہ خیال بہت حد تک صحیح ہے کہ ولی کا دیوان اس عہد کے شاعروں کی بوتی تو ہے۔

"غرض جہاں کا دیوان دلی پہنچا تو اعتبار نے ادب کے ہاتھوں پر لیا۔ قدر دانی نے غور کی آنکھوں سے دیکھا۔ لذت نے زبان سے پڑھا۔ کیت موقوف ہوگئے۔ قوال معرفت کی محفلوں میں انھیں کی غزلیں گانے بجانے لگے۔ ارباب نشاط یاروں کو سنانے لگے۔ جو شبیہت موزوں رکھتے تھے انھیں دیوان بنانے کا شوق ہوا۔"[1]

آزاد نے وہی ذکر کلام سے جن غزلوں کا انتخاب کیا ہے ان سے ان کے اس دعوے کی تصدیق ہوتی ہے۔

شاہ مبارک آبرو جن کا اصل نام نجم الدین تھا۔ شاہ محمد غوث گوالیاری کے اولاد میں تھے اور بقول آزاد اپنے زمانے میں مسلم الثبوت شاعر زبان ریختہ کے تھے۔ البتہ ان کے کلام کی بنیاد ایہام اور ذو معنی لفظوں پر ہوتی تھی اور محاورے کو ہرگز ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔"[2]

شیخ شرف الدین مضمون شیخ فرید الدین شکر گنج کی اولاد میں سے تھے۔ اصل بھٹہ سیہ گری تھا لیکن بعد میں کوشہ نشین ہوکر مضمون باندھنے لگے۔ ان کا شمار بھی دور اول کے استادوں میں ہوتا ہے اور ان کے کلام میں ابتدائی شاعروں کا سا رنگ جھلکتا ہے۔

محمد شاکر ناجی، محمد احسن احسن اور غلام مصطفےٰ خاں یکرنگ ابتدائی دور کے شعراء تھے ان کے یہاں خاص انفرادیت نہ سہی لیکن غزل کا فطری رنگ جھلکتا ہے۔ ولی اور ان کے معاصرین کے بارے میں آزاد کا رویہ بہتر ہے۔

۱۔ "آب حیات" ص ۸۷

۲۔ ایضاً ص ۹۱

"ایجاد و بانی اور اصلاح پذیر ماسٹر تھے۔ ملک کی زبان میں جو کچھ کیا اچھا کیا۔ جو کام باقی ہے اچھے نکتہ پردازوں کے لئے چھوڑ چلے ہیں"۔[1]

اردو شاعری کا دوسرا دور شاہ حاتم سے شروع ہوتا ہے۔ اس عہد کے شاعر شاہ حاتم کے علاوہ سراج الدین علی خان آرزو اور شرف علی خان فغاں ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مشاہیر شعرا تھے۔ اس فصل میں شعراء کے دواوین بقول آزاد کے اردو زبان کے حسن قدرتی کے لئے موسم بہار ہیں۔

"اس میں تو کلام نہیں کہ یہ باغ بھی ایسے ہی شہد کی مکھی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ دریائے محبت میں ڈوبے ہوئے ہیں مگر اس خوبی کا وصف کسی زبان سے ادا نہیں ہوتا کہ کچھ دل میں ہوتا ہے جون کا توں ادا کر دیتے ہیں۔ ہیاسی رنگوں کے طوطے میٹھا نہیں بناتے ..... تم دیکھنا بے تکلف بولی اور سیدھی باتوں سے جو کچھ دل میں آئے گا ایسا بے ساختہ سہہ دیں گے کہ سامنے تو بے تھوڑی گرد پنکھے۔ اور جب تک سننے والے سنیں کے کلیجے پکڑ کر رہ جائیں کہ اس کا سبب کیا؟ وہی بے ساختہ پن جو سادہ پن پر ہزار بناؤ بانکپن قربان ہوئے ہیں"۔[2]

اس دور کے سب سے ممتاز شاعر شاہ حاتم تھے جن کا پورا نام شیخ ظہور الدین تھا۔ وہ پہلے سپاہی پیشہ تھے لیکن بعد میں انہوں نے فقیری اختیار کر لی۔ عمر کوئی نا ملکہ قدرتی تھا۔ آزاد کے بقول ان کا کلیات بہت بڑا ہے جو اکثر زبان قدیم کی غزل اور قصائد اور رباعیات وغیرہ پر مشتمل ہے۔ آخری عمر میں کلیات مذکور سے خود انتخاب کر کے ایک چھوٹا دیوان مرتب کیا۔ اس کا نام "دیوان زادہ" رکھا کیونکہ پہلے دیوان سے پیدا ہوا تھا۔ اس مختصر دیوان کے دیباچے میں انہوں نے فارسی میں مرزا صائب اور ریختہ میں ولی کو اپنا استاد مانا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے زبان ہندی یعنی بھاشا کی جگہ روز مرہ

۱۔ "آب حیات"۔ ص ۱۰۸

۲۔ ایضاً۔ ص ۱۰۶

کی زبان جو پسند خاص و عام تھا استعمار تھا ۔ آزاد نے بجا طور پر حاتم کو اردو غزل گویوں کی صف میں ممتاز جگہ دی ہے ۔ ان کے کلام سے جو انتخاب غزلوں کا پیش کیا ہے وہ بہت حد تک اس عہد کی شاعری کی نمائندگی کرتا ہے ۔

سراج الدین علی خان آرزو اگرچہ اردو کے شاعر نہیں تھے اور فارسی تصنیفات ہی ان کا زاد راہ ہے لیکن ان کے متعلق یہ لکھنا کافی ہے کہ خان آرزو وہی شخص ہیں جن کے دامن تربیت سے مرزا جان جاناں ، مرزا رفیع سودا ، میر تقی میر اور خواجہ میر درد جیسے استاد کامل پرور پاکر اٹھے جنھوں نے اردو شاعری بالخصوص غزل کو چار چاند لگا دئے ۔ اس دور کی تاریخ نامکمل رہے گی اگر اشرف علی خان فغاں کا ذکر نہ کیا جائے ۔ فغاں شاعری پیشہ نہ تھے مگر ابتدائے عمر سے ہی شعر گوئی کا شوق ہوا اور انھوں نے اپنے معاصرین کے رنگ میں لکھا بہت خوب ہے ۔ آزاد لکھتے ہیں کہ

" اگرچہ فغاں کی زبان اس زمانے کی زبان ہے مگر فن شاعری کے اعتبار سے نہایت بااصول اور برجستہ ہے "[1]

آزاد نے فغاں کی غزل گوئی سے زیادہ ان کی تیزی و طراری اور لیہ نوئی اور حاضر جوابی کو زیادہ اہمیت دی ہے ۔ بہرحال " آب حیات " میں منتخب غزلیں اس امر کی شاہد ہیں کہ اس دور کے دوسرے شاعروں کی طرح فغاں کے یہاں نہ استعاروں کے پیچ ہیں اور نہ تشبیہوں کی رنگا رنگی ۔ اپنے خیالات کو صاف صاف زبان اور سیدھے سادے محاورے میں اس طرح بیان کر گئے کہ آج تک سنتا ہے سر دھنتا ہے ۔

اردو شاعری کا تیسرا دور مرزا جان جاناں مظہر ، مرزا محمد رفیع سودا ، خواجہ میر درد ، سید محمد میر سوز اور خدائے سخن میر تقی میر کی غزل گوئی کا دور ہے ۔ یہ وہ بادشاہ ہیں جن کے انداز پا میں بقول آزاد " فصاحت آنکھیں بچھاتی ہے اور بلاغت قدموں کو چومتی جاتی ہے "[2]

۱۔ " آب حیات " ص ۱۱۹
۲۔ ایضاً ، ص ۱۲۳

آزاد نے ان مشاہیر کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا ہے " اگرچہ بہت سے مرصع کار و میناکار پیدا آئے مگر اس فخر کا تولنا ہمارا انہیں بزرگوں کے گلے میں رہا "[1]

اس دور کے عظیم غزل گو شاعروں سے مرعوب ہو کر آزاد کمال جوش عقیدت میں لکھتے ہیں کہ

" جب یہ باکمال چمن کلام میں آئے تو اپنے بزرگوں کی چمن بندی کی سیر کی۔ فراست کے پھول کو دیکھا کہ قدرتی بہار میں حسن خداداد کا جوبن دکھا رہا ہے چونکہ انہیں بھی ناموری کا تمغہ لینا تھا اس لئے پیڑوں سے بڑھ کر قدم مارنے چاہیے۔ یہ گرد و پیش کے میدانوں میں بہت دوڑے سب پھول کام میں آئے ہوئے تھے۔ جب سامنے جگہ نہ پایا تو ناچار اپنی عمارتوں کو اونچا اٹھایا۔ تم دیکھنا کہ وہ بلندی کے مضمون نہ لائیں گے۔ آسمان سے تارے اتار لیں گے۔ قدر دانوں سے فقط داد نہ لیں گے۔ پوستہ لیں گے لیکن نہ وہ پوستہ کہ سامری کی شرح عارضی ہو۔ ان کے کمال کا دامن قیامت کے دامن سے بندھا ہوا ہے۔ یہ اپنی صفت میں کچھ کچھ تکلف بھی کریں گے مگر ایسا جیسے گلاب کے پھول پر شبنم یا تصویر پر آئینہ۔ ان کا تکلف بھی اصلی صفت پر کچھ لطف زیادہ کرے گا۔ اس کی خوبی پر پردہ نہ ہوگا۔ تم میر صاحب اور خواجہ میر درد کو دیکھو گے کہ اس میں ڈوبے ہوں گے۔ سودا کا کلام باوجود بلندی مضمون اور چستی بندش کے تاثیر کا طلسم ہوگا "[2]

یہ امر قابل غور ہے کہ آزاد ان مشاہیر کے کمالات کے معترف ہونے کے باوجود یہ محسوس کرتے ہیں کہ انہوں نے غزل کی ترقی میں طبیعت کی بلند پروازی سے اوپر کی طرف ہی کیا مگر آگے ایک قدم نہیں بڑھا سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ بزرگ بھی حسن و عشق کے محدود چمن سے باہر نہیں نکل سکے اور نہ ان میدانوں میں پہنچ سکے جن کی نہ وسعت کی انتہا ہے اور نہ عجائب و لطائف

۱۔ " آب حیات " ص ۱۲۳

۲۔ ایضاً " ص ۱۲۳

نا مار ہے۔[1]

مرزا ان اثاث مظہر رئیسوں سے تیموری خاندان کے تھے۔ اوائل عمر میں باپ کے انتقال کے بعد فقیری کی طرف مائل ہوگئے پھر تیس برس کی عمر تک مدرسوں اور خانقاہوں میں ماڑو دیتے رہے اس کے انھوں نے اپنی والی کے بھول بزرگوں کے روضوں پر چڑھا دیا۔ ان کے کلام میں لطافت اور سلاست عام ہے۔ انھوں نے اپنی زبان کو کبھی اس طرح سے تراشا کہ بعد میں آنے والے شاعروں نے اسے بطور نمونے کے قبول کیا۔ آزاد نے مرزا مظہر کی شاعری پر کوئی خاص تبصرہ نہیں کیا ہے۔ لیکن ان کے سوانح حیات سے عزت کوئی پر خاص روشنی پڑتی ہے۔

مرزا رفیع سودا دہلی کے باکمال شاعروں میں تھے انھوں نے شاہ حاتم کی شاگردی کی اور خان آرزو کی صحبت سے بہت فائدہ حاصل کیا۔ انھیں کے مشورے سے سودا اردو شاعری کی طرف منسوب ہوئے۔ آزاد نے سودا کے حالات زندگی کو لکھنؤ میں قیام و دربار کی سرپرستی کو خاص اہمیت دیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے سودا کے کلام کی تفصیل بالخصوص قصیدوں و مثنویوں اور ہجوؤں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ وہ مرزا کو فن شاعری میں مسلم الثبوت استاد مانتے ہیں کیونکہ میر تقی میر نے بھی انھیں پورا شاعر مانا ہے۔ ان کے کلام میں طبیعت کی روانی ہر جگہ نمایاں ہے اور دل کا کنول ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ آزاد کے بقول "سودا کے نظم کا زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست و گریباں ہے جیسے آب کے عنصر میں گرمی اور روشنی"۔[2]

جن مشاہیر نے زبان اردو کو صاف کیا ہے مرزا کا ان میں پہلا نمبر ہے۔ انھوں نے فارسی محاوروں کو بھاشا میں کھپا کر ایسا ایجاد کیا ہے جیسے علم کیمیا کا ماہر ایک مادے کو دوسرے مادے میں جذب کر دیتا ہے۔ اور تیسرا مادہ پیدا کر دیتا ہے۔

سودا پر لکھتے ہوئے آزاد نرمی طور پر میر تقی میر کا ذکر کرتے ہیں اور عوام میں مروج اس بات کی کہ سودا میدان کے بادشاہ ہیں اور میر تقی میر غزل کے شہنشاہ ہیں تردید

۱۔ "آب حیات" ص ۱۲۳ تا ۱۲۴

۲۔ ایضاً ص ۱۵

رتیے ہین ۔ یہ مانتے ہوئے بھی کہ دونون شاعرون کو ورثے مین بزرگون کی امانت ملی لیکن ان کے بیانات مختلف تھے ۔ اس سلسلے مین وہ حکیم سید رتن اسلہ قاسم کے حوالے سے کہتے ہین " مرزا دریائے ایست بیکران و میر نہریست عظیم الشان در معلومات فوائد میر را بر مرزا برتری است و در قوت شاعری مرزا را بر میر سروری "۔[1] اس فیصلے پر آزاد اپنی رائے کا اظہار دو طرح سے کرتے ہین ۔

" میر صاحب کی طبیعت قدرتی درد خیز اور دل حسرت انگیز تھا کہ غزل کیجیے جان ہے ۔ اس لئے ان کی غزلین ہی ہین اور خاص خاص بحور و قوافی مین ہین کہ مرزا کی طبیعت ہمہ رنگ اور ہمہ گیر ۔ ذہن ہر اور زبان مشتاق رکھتے تھے ۔ تو سخن فکر ان کا منہ زور گھوڑے کی طرح جس طرف جاتا تھا رک نہ سکتا تھا ۔ کوئی بحر اور کوئی قافیہ ان کے ہاتھ آئے تغزل کی خوبیت نہین رہتی تھی ۔ بس برجستہ مضمون مین بند ہو جائے باندھ لیتے تھے یہی سبب ان کی غزلون کے بھی اکثر عمر چستی اور درستی مین قصیدے کا رنگ دکھاتے ہین "۔[2]

آزاد بے دید تنقید یا تقابلی تنقید کے گر سے زیادہ واقف نہین ہین سخن میر و سودا کی غزل گوئی کے سلسلے مین ان کی رائین بہت وقیع ہین ۔

سودا کے معاصرین مین خواجہ میر درد کا ایک ممتاز مقام ہے ۔ آزاد نے انھین زبان اردو کے چار رکنون مین سے ایک رکن قرار دیا ہے "۔[3] ان کا اردو دیوان ہم عصرون کے مقابلے مین بہت مختصر ہے ۔ سوا غزلیات و ترجیع بند اور رباعیون کے کچھ نہین ۔ آزاد نے درد کی غزلیہ شاعری پر چند ملیح رائے دی ہین جو معنی خیز ہین ۔

۱۔ " آب حیات " ص ۱۵۵
۲۔ ایضاً " ص ۱۵۶
۳۔ ایضاً " ص ۱۷۹

" خواجہ میر درد صاحب کی غزل سات شعر تو شعر کی ہوتی ہے۔ مگر انتخاب ہوتی ہے۔ خصوصاً چھوٹی چھوٹی بحروں میں جو اکثر غزلیں کہتے تھے گویا تلواروں کی آبداری نشتر میں بھر دیتے تھے۔ خیالات ان کے سنجیدہ اور متین تھے۔ ..... تصوف جیسا انھوں نے کہا اردو میں آج تک کسی سے نہیں ہوا "۔[1]

آزاد نے درد کے کلام کی عشقیہ اور صوفیانہ دونوں پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ بعد کے نقادوں نے ان کی صوفیانہ شاعری کو زیادہ اہمیت دی حالانکہ ان کی غزل میں مجازی عشق کا پہلو بھی کم نمایاں نہیں ہے۔ اس کی طرف خلیل الرحمن اعظمی نے اپنے مضمون " خواجہ درد کو " محبوب میں " میں بخوبی اشارہ کیا ہے۔

سید محمد میر سوز بھی خواجہ درد کے ہم عصر ہیں۔ یہ وہی شخص ہیں جنھیں میر تقی میر نے استاد شاعر مانا ہے۔ پورے شاعر سودا اور آدھے شاعر درد تھے۔ میر سوز بھی اپنے زمانے کے بے مثل اور تھے لیکن ان کی طبع موزوں کے آئینہ کو فصاحت نے صفائی سے جلا کی تھی۔ آزاد رقمطراز ہیں:۔

" میر سوز مرحوم کی زبان عجب میٹھی زبان ہے اور حقیقت میں غزل کی جان ہے چنانچہ غزلیں خود ہی کہتے دیتی ہیں ان کی اتنا پردازی کا ، حسن تکلف اور صنائع معنوی سے بالکل پاک ہے۔ اس خوشنمائی کی ایسی مثال ہے جیسے ایک گلاب کا پھول ہری بھری ٹہنی پر کتورہ سا دھرا ہے اور سبز سبز پتوں میں اپنا اصلی روپ دکھا رہا ہے۔ "[2]

اس میں کوئی شک نہیں کہ میر سوز نے اپنی غزلوں میں روایتی مضامین یعنی عاشق و معشوق کے معاملات اور ہجر و وصال کے خیالات کو وسعت دی ہے۔ چنانچہ وہ پیرے مضامین باندھتے تھے ویسے ہی زبان بھی لیتے تھے اور سادگی میں بھی ایک خاص تاثیر تھی۔ اس سلسلے میں آزاد

۱۔ " آب حیات " ص ۱۷۶
۲۔ ایضاً " ص ۱۸۶

لا تون ہے کہ

" میر سوز جیسے سہل ہے مضمون باندھتے تھے ویسے ہی آسان آسان طرحیں بھی لیتے تھے بلکہ اکثر ردیف کو چھوڑ کر قافیہ پر اکتفا کرتے تھے۔ ان کے عصر کا عوام فقط محاورہ کی خامی پر ہے۔ اضافہ تشبیہ و استعارہ و فارسی ترکیبیں ان کے کلام میں بہت کم ہیں۔ ان لحاظوں سے انھیں گویا اردو غزل کا پہلا سعدی کہنا چاہئے"[1]

دور سوم کے سب سے ممتاز غزل گو شاعر میر تقی میر ہیں۔ انھیں ابتدا سے ہی غزل کا شوق تھا باوجود انتقال کے بعد اکبرآباد سے دہلی آئے اور خان آرزو کے پاس انھوں نے اور ان سے شاعری نے پرورش پائی۔ شاعری میں وہ کمال حاصل کیا کہ بقول آزاد کے " مسافر ان کی غزلوں کو تحفہ کے طور پر شہر سے شہر میں لیے جاتے تھے" ان کی غزلوں کے چھ دیوان ہیں۔ اگرچہ ان میں ہر طرح کی غزلیں ہیں لیکن جو انتخاب ہے وہ فصاحت کے عالم میں انتخاب ہے۔ میر کے بہتر نشتر انھیں منتخب غزلوں کے مرہون منت ہیں۔ آزاد کا خیال ہے کہ میر نے زبان اور خیالات میں جس قدر صفائی پیدا کی ہے اتنا ہی بلاغت کو کم کیا ہے۔ اس لحاظ سے میر کی غزل اپنی غزلیت کے لحاظ سے سودا سے بہتر ہے۔ آزاد اردو تذکرہ نگاروں اور نقادوں میں غالباً پہلے شخص ہیں جنھوں نے میر کی قادر الکلامی اور ان کے کلام میں سوز و گداز اور زبان و محاورے کے موزوں استعمال پر داد تحسین دی ہے۔

سعید " میر صاحب کی زبان شستہ و کلام صاف و بیان ایسا پاکیزہ جیسے باتیں کرتے ہیں۔ دل کے خیالات کو سب کی بیمعنوں کے مناسب ہیں۔ محاورہ و روزمرہ بکر باتوں باتوں میں ادا کر دیتے ہیں اور زبان میں خدا نے ایسی تاثیر دی ہے کہ وہی باتیں ایسے مضمون بن جاتی ہیں۔ اس واسطے ان میں بہ نسبت اور شعرا کے اصلیت کچھ زیادہ قائم رہتی ہے بلکہ اکثر جگہ

۱۔ " آب حیات" ، ۱۸۷

یہی معلوم ہوتا ہے گویا شعر کی تصویر کھینچ رہے ہیں۔ یہی سبب ہے
کہ دلوں پر اثر بھی زیادہ کرتی ہے۔ وہ گویا اردو کے سعدی ہیں
ہمارے عاشق مزاج شعراء کی رنگینیاں اور خیالات کی بلند پروازیاں ان کے
مبالغوں کے جو رو خروش سب کو معلوم ہے مگر اسے قسمت کا لکھا سمجھو کہ
ان میں سے بھی میر صاحب کو شگفتگی یا بہار عیش و نشاط یا کامیابی
وصال کا لطف کبھی نصیب نہ ہوا۔ وہی مصیبت اور قسمت کا غم جو ساتھ
لائے تھے اس کا دکھڑا سناتے چلے گئے جو آج تک دلوں میں اثر اور سینوں
میں درد پیدا کرتے ہیں کیونکہ ایسے مناظر اور شعراء کے لئے خیالی تھے
ان کے حالی تھے عشق عاشقانہ خیال بھی ناکامی، زار نالی، حسرت مایوسی،
ہر کے لباس میں خرچ ہوئے۔ ان کا کلام صاف کہہ رہا ہے کہ جب سے دل سے
نکل کر آیا ہوں وہ غم و درد کا پتلا نہیں حسرت و اندوہ کا جنازہ تھا
ہمیشہ وہی خیالات بسے رہتے ہیں بس جو دل پر گزرتے ہیں وہی زبان سے
کہہ دیتے ہیں کہ سننے والوں کے لئے نشتر کا کام کر جاتے ہیں"۔[1]

میر کے بیسویں صدی کے نقادوں میں مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر عبداللہ، خواجہ فاروقی اور
دیگر نقادوں نے ان کی غزل گوئی پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن کسی نے آزاد کی تردید نہیں کی ہے۔
"آب حیات" کا دور اردو شعر و غزل کے ان مناظر کے کلام پر محیط ہے جنہیں
ہم دبستان لکھنؤ سے منسوب کرتے ہیں اس دور کے خاص شاعروں میں جرأت، انشا اور مصحفی
ممتاز ہیں۔ یہ عہد دراصل ان مہاجرین شعراء کا ہے جنہوں نے دلی سلطنت کے زوال کے بعد
لکھنؤ کا رخ کیا۔ ان کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت زندہ دلی اور شوخی طبعی ہے۔ وہ
قدماء کی عمارتوں کو بلند کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے البتہ انہیں سجانے میں ان مناظر نے

۱۔ "آب حیات"، ص ۳۲، ۲۰۳

اپنے تمالات و تعاثیر ۔ آزاد نے اپنے معدوح انداز میں اس دور کے شعراء کے متعلق لکھا ہے کہ

" ہر شے کو رنگ بدل کر دکھائیں گے ۔ وہی پھول عطر میں بسائیں گے کبھی ہار بنائیں گے ۔ کبھی طرے سائیں گے ۔ کبھی انھیں کو پھولوں کی گیند میں بنائیں گے اور وہ گل بازی کریں گے کہ ہولی کے جلسے گرد ہو جائیں گے"[1]

یہی قلندر بخش جرات کا تعلق اکبرآباد سے تھا مگر ان کے باپ خاص دلی کے رہنے والے تھے ۔ نادر شاہ کے حملے کے بعد وہ بریلی پہنچے اور وہاں سے لکھنؤ آکر مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم ہوگئے ۔ جرات کے کلام میں قدماء کا رنگ صاف جھلکتا ہے ۔ انھوں نے استادوں کے اسلوب کو نہایت سلیقے سے برتا ہے ۔ بقول آزاد کے ان کی طبیعت غزل کے لئے نہایت مناسب تھی قدماء میں انھوں نے میر کے انداز کو اپنایا مگر اس میں فصاحت و سادگی کے ساتھ شوخی اور بانکپن کا انداز ایسا بڑھایا کہ ان کی شاعری کی دھوم مچ گئی ۔ آزاد لکھتے ہیں کہ

" ان کی طرز انھیں کا ایجاد ہے اور آج تک انھیں کے لئے خاص ہے ۔ جیسی اس وقت مقبول خلق تھی آج تک ویسی ہی چلی آتی ہے ۔ خصوصیت اس میں یہ ہے کہ فصاحت اور محاورہ کی جان ہے فقط حسن و عشق کے معاملات میں اور عاشق و معشوق کے خیالات گویا اس میں شراب ناب کا سرور پیدا کر دیتے ہیں ان کی طبیعت غزل کے لئے عین مناسب واقع ہوئی تھی ۔ حریف و ظریف خوش طبع عاشق مزاج تھے البتہ استعداد عملی کا اور فکری و شاعری کا جزو اعظم ہے ۔ ان کی طبیعت بجائے محنت پسند ہونے کے عشرت پسند تھی .....
اس عالم میں جو جو باتیں ان پر اور ان کے دل پر گزرتی تھیں سو کہہ دیتے تھے مگر ایسی کہتے تھے کہ اب تک دل پھڑکتا ہے ہیں "۔[2]

اس میں شک نہیں کہ جرات کے مزاج میں کھلنڈرا پن تو زیادہ دخل تھا ۔ نوابین اور ارباب

۱۔ " آب حیات " ص ۲۲۱
۲۔ ایضاً " ص ۲۲۸ ، ۲۲۹

نشاط کی جب میں اسے اور بھی چمکایا ۔ ان کے یہاں نہ تو تد ماء کی فکری سادگی ہے اور نہ
درد کے بے ہنگم کی بانکپن کی ۔ میر کا انداز انھوں نے ضرور استعمال اختیار کیا لیکن کلام میں
سوز و گداز کا پتا نہیں چلتا ۔ آزاد نے رات کے کلام پر میر کے مقولے کا بھی حوالہ دیا ہے
کسی مشاعرے میں سامعین سے تعریف سن کر انھوں نے میر سے بھی رائے دریافت کی وہ تو غزل کے
نام جوہری تھے فرمایا " کیفیت اس کی یہ ہے تم شعر تو کہہ نہیں انتیے ہو اپنی جوما جاتی
نہلیا کرو "[1] اس دور کے دوسرے مشہور شاعر سید انشاء اللہ خاں انشا ہیں ۔ وہ بھی ایک
عرصے تک دلی کے بادشاہ شاہ عالم کے دربار میں کئی افشانی کرنے کے بعد لکھنؤ آگئے اور
آصف الدولہ کی سرپرستی میں مشاعرے میں شرکت کرنے لگے ۔ آزاد نے ان کی ذہانت، طباعی،
شوخی اور لطافت کا خاص طور سے ذکر کیا ہے انشا کے سلسلے میں تحقیق طلب مسئلہ یہ ہے کہ
آزاد نے لکھا ہے کہ وہ آخری عمر میں مسنون ہوگئے تھے ۔ غالباً فرحت اللہ بیگ نے اپنی
کتاب موسوم انشا میں اس بیان کو حقیقت کے خلاف بتایا ہے ۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی نے
انشا کے ہم عصر پنڈتا لکھنوی کا قول اپنی کتاب " آب حیات کا تنقیدی مطالعہ " میں درج کیا
ہے ۔ " آخر آخر مسنون شدہ ند سال گذشتہ بودند کہ بہ ہمہ مزن در گذشت "[2] انشا
کی غزلوں پر آزاد نے چند سطروں میں اظہار خیال کیا ہے ۔

" غزلوں کا دیوان عجب طلسمات کا عالم ہے ۔ زبان پر قدرت کامل
بیان کا لطف، محاوروں کی نمکینی، ترکیبوں کی خوشنما تراشیں دیکھنے
کے قابل ہیں مگر یہ عالم ہے کہ ابھی کچھ ہے ابھی کچھ ہے ۔ جو غزلیں
یا غزلوں میں اشعار با اصول ہوگئے وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں اور جہاں
طبیعت اور طرف پاتی وہاں تھکانا نہیں ۔ غزلوں میں غزلیت کے اصول کی
پابندی نہیں ۔ سبب یہ ہے کہ وہ سخن آفرینی ایسے ذخیرہ وافر مضامین و

۱۔ " آب حیات " ، ص ۲۳
۲۔ آب حیات کا تنقیدی مطالعہ ، ص ۵۹

الفاظ کا اسیر اسر رہتا تھا ۔ اس سے جس قسم کی مضمون چاہتا تھا پیدا کرلیتا تھا "۔[1]

رات اور اتنا کے ساتھ تیسرا نام غلام ہمدانی مصحفی کا آتا ہے وہ بھی اپنے دور مشہور و معروف استاد تھے اور ان شعرا " میں آپ میں مصحفی بھی ایسے ہی مہاجر شاعر تھے جنھوں نے دلی چھوڑ کر لکھنؤ میں سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازمت کرلی ۔ آزاد نے ان کے ارد و دم کے بارے میں لکھا ہے کہ مصحفی نے جہد پیران مسلسل کیے ۔ جن سے ان کی استاد کا واقعی ثبوت ملتا ہے ۔ انھوں نے انواع و اقسام کی سینکڑوں غزلیں لکھیں اور سنگلاخ زمینوں میں بھی طبع آزمائی کی لیکن انکے کلام میں کوئی انفرادیت نہیں پائی جاتی ۔

" زبان سادہ ہی ہے وہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر سوز کے انداز پر چلتے ہیں ۔ اس وجہ میں اکثر شعر میر صاحب کی بھی جگہ دکھاتے ہیں مگر وہاں کے وہی ہیں وہ انھیں کے ساتھ ہیں ۔ یہ اس ڈھنگ میں کہتے ہیں تو پھسڈی ہوجاتے ہیں ۔"[2]

آزاد نے مصحفی کی کوئی خوبی کلام میں نہیں کا سبب بتایا ہے چونکہ ان کی طبیعت روان تھی اس لئے غزلوں میں سب رنگ کے شعر ہوتے تھے ۔ کچھ صاف اور برجستہ اور کچھ ۔ بودے ۔ کبھی بھی ان کے یہاں ڈھیلی ڈھالی بندشوں میں ایسی غزلیں ہیں جنھیں اعلیٰ کلام نہیں کہا جاتا ۔ آزاد اسے " امروہہ پن " پر محمول کرتے ہیں ۔ یہ صحیح ہے کہ مصحفی کے یہاں ایسے ہم عصروں کی شوخی اور چلبلاہٹ نہیں ہے لیکن انھوں نے بھی میدان غزل میں بہت سے معرکے سر کیے اور متاخرین میں داد تحسین حاصل کرنے میں کسی سے زیادہ پیچھے نہ رہے ۔

" آب حیات " کا پانچواں دور مدرسہ لکھنؤ کے شعرا " میں امام بخش ناسخ ، خواجہ حیدر علی آتش اور متاخرین شعرائے دہلی شاہ نصیر ، مومن خاں مومن ، شیخ ابراہیم ذوق اور

۱۔ آب حیات ص ۲۵۸

۲۔ آب حیات ص ۲۹۸

مرزا غالب کے قدم کے جانشین ہو مشتمل ہے ۔ یہ دور اردو غزل کا سنہرا زمانہ ہے جس میں ایسے ماہر پیدا ہوئے جن کی غزل کوثی کا سکہ آج تک رواں ہے ۔ آتش و مومن اور غالب اپنے زمانے کے نمایندہ ہی نہیں بلکہ آسمان سخن کے دائمی درخشندہ ستارے ہیں ۔ جن پر اردو ادب ہمیشہ ناز کرے گا ۔ آزاد اپنے مخصوص انداز میں ان مناہیر کا استقبال کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔ کہ اس مناعرے میں ایسے بزرگ شامل ہیں جن کے دیدار ہماری آنکھوں کا سرمہ ہیں ۔

" اس میں دو قسم کے باکمال نظر آئیں گے ایک وہ کہ جنھوں نے اپنے بزرگوں کی میراث کو دین آئین سمجھا ۔ یہ ان کے باغوں میں پھریں گے ۔ پرانی شاخیں ۔ زرد پتے کانٹے چھانٹیں گے اور نئے رنگ اور نئے ڈھنگ کے گلدستے بنا بنا کر گلدانوں سے طاق و ایوان سجائیں گے ۔ دوسرے وہ جنھوں نے دماغ و فکر کے دکان سے ایجاد کی ۔ ہوائیں اڑائیں گے اور بر آتش بازی کی طرح اس سے رتبہ عالی پائیں گے "[1]

آزاد نے لکھنؤ اسکول کے شاعروں پر متعلق جو عام رائے قائم کی ہے وہ بہت حد تک صحیح ہے ۔ کیونکہ جب ان کے پیرو باغوں اپنے اپنے طاق میں لاچکے تھے تو ان مناہیر کے لئے نئے نئے گل کھلانا ناممکن تھا ۔ چنانچہ انھوں نے نئے انداز سے چلنوں پرانے ہوؤں کو ہی ۔ اپنے میں اپنی عافیت سمجھی اور اس طرح اپنے ہم عصروں میں تاج افتخار پایا ۔

شیخ امام بخش کی شاعری کا وطن لکھنؤ تھا ۔ وہ شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے ۔ پیر ہیں ۔ ان کو ابتدا سے شعر سے شغف تھا انھوں نے میر تقی میر کی خدمت میں کئی غزلیں اصلاح کے لئے پیش کیں مگر انھوں نے کوئی توجہ نہیں کی اس پر دل شکستہ ہوکر انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں اپنے کلام کو خود ہی اصلاح دونگا ۔ عربی مناعروں اور اہل کلام مناہیر کی صحبتوں میں خود بخود ان کی طبیعت اصلاح پاتی گئی ۔ بقول آزاد شیخ ناسخ کے دیوان

---

۱ ۔ آب حیات ص ۳۲۵

تھن ھین مگر د و مشہور ھین ۔ ن مین " د ختر ریشان " اھم ہے ۔آزاد کا قول ھیر کہ ان ا کلام ظاھری عیبون سیر بہت حد تک پاک ھیر اور وہ ایسیر اصول رست تھیر کہ جاھیر ترتیب کی سستی یا نظم کی گرمی مین فرق پڑ ائیر مگر فن شعر سے قطعی انحراف نہین کرتیے ۔ ناسخ کیر کلام پر تبصرہ کرتیر ھوئیر آزاد لکھتیر ھین ۔

" غزلون مین شوکت الفاظ اور بلند پروازی اور نازک خیالی بہت ھیر ۔ اور تاثیر کم ۔ صائب کی تشبیہہ و تمثیل کو اپنی سند صنعت مین ترکیب دیکر ایسی دستکاری اور مینا کاری فرمائی کہ بعض موقع پر بیدل اور ناصر علی کی حد مین جا پڑیر اور اردو مین وہ اسیر صاحب طرز قرار پائیر ۔ انھین ناسخ کہنا بجا ھیر کیونکہ طرز قدیم کو نسخ کیا جس کا خود بھی انھین فخر تھا ۔[1]

آزاد نیر جس طر مصحفی اور ان سیر پہلیر دوسرر شعرائیر لکھنؤ کیر حالات اور انشا سیر متعلق بہت سیر لطیفیر بیان کئیر ھین ۔ اسطر ناسخ کی شخصیت اور ان کی پہلوانی اور خوش خوراکی کا ذکر زیادہ کیا ھیر ۔ اور ان کی شاعری پر سرسری نگاہ ڈال کر رہ گئیر ھین ۔ البتہ انھون نیر خواجہ آتش کیر متقدمین کیر اعتراضات کا بہت حد تک جواب دیا ھیر اور شیخ کی شاعری کی حمایت اور وکالت کی ھیر ۔ خواجہ آتش کیر پیرو کہتیر تھیر کہ شیخ ناسخ کی اکثر نازک خیالیان بلند پروازی و کاہ برآوردن ھین ۔ آزاد اس کا جواب یہ دیتیر ھین کہ فارسی مین جلال اسیر و قاسم مشہدی و بیدل اور ناصر علی ایسیر استاد گزرر ھین جنھون نیر اپنی نازک خیالیون کیر بدولت خیال بند لقب حاصل کیا ھیر اور اگر شیخ صاحب نیر ان کی طرز اختیار کی تو اس مین کوئی برائی نہین ۔ ناسخ کیر کلام پر ان کیر حریفون کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ وہ اکثر سخت اور سنگین الفاظ استعمال کرتیر ھین کیر بھاری وزن کا بوجھ غزل کی نزاکت اور لطافت ھر کر

۱۔ آب حیات ص ۳۴۵

برداشت نہین کرسکتی ۔ آزاد کہتے ہین کہ مشکل پسند اور سہل پسند طباع لوگ اگرچہ اپنے خیالون مین مست رہتے ہین مگر ان کا فیض سخن خالی نہین جاتا ۔ اور لئے مشکل کلام مین بھی ایک لطف پیدا ہوجاتا ہے ۔ ناسخ کے حریف ان پر تیسرا الزام یہ لگاتے ہین کہ خود صاحب خود اپنی خیال بندی سے عاجز آگئے تھے اور آتش کے رنگ مین لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے مگر زندگی بھر ہر قسم کی شاعری پر قادر رہے اس سے عہدہ برآ نہین ہوسکے ۔ آزاد نے ایک جج کی حیثیت سے دونون کا مقابلہ کرکے اس طرح سے کہا ہے ۔

" میری رائے مین دونو حریف اور ان کے طرفدار کوئی قابل الزام نہین کیونکہ دونو طرفون مین کوئی کمال سے خالی نہین تھا ۔ البتہ طبیعتین مختلف ہوتی ہین ۔ اور لئے سند مین اختلاف ہے کہنے والے چاہین سو کہین کہے جائین "۔[1]

خواجہ حیدر علی آتش مصحفی کے شاگرد تھے ۔ انھون نے اردو غزل گو گویون مین نہ صرف اپنے معاصرین کے درمیان امتیاز حاصل کیا بلکہ آج بھی ان کا کلام خاص و عام مین اہمیت رکھتا ہے ۔ آزاد کا قول ہے کہ ان کی تمام کلیات ایک دیوان غزلون کا ہے جو کہ ان کے سامنے سامنے رائج ہوگیا تھا اور دوسرا تتمہ ہے جو بعد مین مرتب ہوا ۔ آتش کے کلام کا اثر بہتیرے ہوئے آزاد لکھتے ہین ۔

" وہ کلام ان کا ہے حقیقت مین محاورہ اردو کا دستورالعمل ہے اور انشا پردازی ہند کا اعلی نمونہ ۔ شرفائے لکھنؤ کی بول چال کا انداز اس سے معلوم ہوتا ہے جس طرح لوگ باتین کرتے ہین اسی طرح انھون نے بھی کہہ دیئے ہین ۔ ان کے کلام نے پسند خاص اور قبول عام کی سند حاصل کی اور نہ فقط اپنے شاگردون مین بلکہ ہر غرض اہل انصاف کے

---

۱ ۔ آب حیات ص ۳۴۷

نزدیک بھی مقبول اور قابل تعریف ہوئیں ۔[1]

امر میں کوئی شک نہیں کہ آتش کا طرز بیان صاف اور سہل ہے ۔ مضامین میں جدت نہ سہی لیکن نازک خیالی موجود ہے اگرچہ ان کے یہاں استعاروں اور تشبیہوں میں فارسی شاعری کا اثر ہے لیکن وہ بالکل نہیں کہتے ہیں کہ متاخرین کے لئے متقدمین نے کچھ باقی نہیں چھوڑا ۔ چنانچہ آتش کے یہاں اگر نئے مضامین نہیں تو ایسی لطافتیں اور نزاکتیں ہیں جن سے ہم آج بھی محظوظ ہوتے ہیں ۔

شاہ نصیر کو اگرچہ مقبول کے شاعروں میں جگہ نہیں مل سکتی لیکن چونکہ وہ استاد ذوق کے بھی استاد تھے لہذا آزاد نے ان کو بھی پانچویں دور کے شاعروں میں خاص جگہ دی ہے ۔ شاہ نصیر کو زندگی میں کہیں چین نصیب نہیں ہوا ۔ دہلی ، لکھنؤ اور حیدرآباد کے سفر کے ہیرے نے قسمت نے کبھی آرام و سکون سے نہیں رہنے دیا لہذا ان کا کلام بھی اچھی طرح مرتب نہیں ہوسکا ۔ دہلی کے ایک قدردان سید عبدالرحمن نے بڑی محنت سے ایک مجموعہ ان کے کلام کا جمع کیا آزاد نے ان کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے ۔

" زبان شکوہ الفاظ اور چستی تراکیب میں سودا کی زبان تھی اور گرمی و لذت امر میں خدا داد تھی ۔ انھیں اپنی نئی تشبیہوں اور استعاروں کا دعوی تھا اور یہ دعوی بجا تھا ۔ نئی نئی زمینیں نہایت برجستہ اور سند بدہ نکالتے تھے مگر ایسی سنگلاخ ہوتی تھیں جن میں بڑے بڑے شہسوار قدم نہ مار سکتے تھے ۔ تشبیہہ و استعارہ کو لیا ہے اور نہایت آسانی سے برتا ہے "۔[2]

---

۱ ۔ آب حیات ص ۳۷۵ ، ۳۷۴
۲ ۔ ایضاً ص ۳۹۲

اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہ نصیر دوئم درجے کے معمولی شاعر تھے اور محض ریاضت عمر کی بنا پر نئی نئی زمینیں نکال کر خراج تحسین وصول کرنے کی کوشش کرتے تھے ۔ اہل نظر ان کے کلام کی دھوم دھام کو کنکھیوں سے دیکھتے تھے اور کبھی کبھی ان کا مذاق بھی اڑایا جاتا ۔ حد یہ ہے کہ اکثر اوقات ان کی وہ سے استاد ذوق کو بھی غرمند کی اٹھانی پڑتی ۔

" آب حیات " کی پہلی اشاعت میں آزاد نے مومن خان مومن کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا اس پر اہل نظر نے شدید طور پر مصنف کو اس کا احساس دلایا چنانچہ کتاب کی دوسری اشاعت میں انھیں بھی اٹھارویں دور کے شاعروں میں ممتاز جگہ دی گئی ۔ آزاد نے مومن خان کا حال قدرے تفصیل سے لکھا ہے مگر ان کی شاعری پر سرسری تذکرہ پر ہی اکتفا کیا ہے ۔ آزاد کا قول ہے کہ مومن کو شعر و سخن سے طبعی مناسبت تھی اور عاشق مزاجی نے اسے اور چمکا دیا تھا ۔ انھوں نے ابتدا میں شاہ نصیر کو اپنا کلام دکھایا مگر چند روز کے بعد ان سے اصلاح لینی چھوڑ دی اور کسی کو اپنا استاد نہیں بنایا شاعری ان کے لئے تفریح طبع کا ذریعہ تھی لیکن عمر گوئی کا ملکہ فطری تھا بقول آزاد ۔

" غزلوں میں ان کے خیالات نہایت نازک اور مضامین عالی ہیں ۔ استعارہ اور تشبیہ کے زور نے اور بھی اعلیٰ درجے پر پہنچا دیا ہے ان میں معاملات عاشقانہ عجیب مزے سے ادا کئے ہیں ۔ اس واسطے جو شعر صاف ہوتا ہے اس کا انداز جرات سے ملتا ہے اور اس پر وہ خود بھی نازاں تھے ۔ اشعار مذکورہ میں فارسی کی عمدہ ترکیبیں اور دلکش تراکیب ہیں کہ اردو کی سلاست میں اشکال پیدا کرتی ہیں ۔ ان کی زبان میں چند وصف خاص ہیں جن کا تانا لطف سے خالی نہیں ۔ وہ اکثر اشعار میں ایک شے کو کسی صفت خاص کے لحاظ سے ذات شے کی طرف نسبت کرتے ہیں اور اس طرح شعر میں عجیب لطف لطایف بلکہ معانی پنہانی پیدا کرتے ہیں[1]

---

۱ ۔ آب حیات ۔ ص ۴۱۳ ، ۴۱۴

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ آزاد مومن کے کلام کے ساتھ انصاف نہیں کرسکے۔ ان کا تبصرہ سرسری اور سطحی ہے اس کی بہن وجہ یہ ہے کہ اس دور کے دو شاعر یعنی ذوق اور غالب ان کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے ذوق تو خیر استاد تھے لہذا ان کے سر پر ملک الشعرائی کا تاج رکھنا ہی تھا غالب بھی اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے جن کے زور بیان سے آزاد بہرحال مرعوب تھے۔ اس میں کلام نہیں کہ مومن اپنے دور کے بے مثل غزل گو شاعر ہیں جنھوں نے قدماء سے استفادہ کے علاوہ اپنی فطری صلاحیت اور طباعی سے اردو غزل میں نئے اضافے کئے۔ آزاد نے شیخ ابراہیم ذوق کا بیان اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں دھاگے میں پرو کیا ہے۔

" جب وہ صاحب کمال عالم ارواح سے کشور اسلام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغ قدس کے پھولوں کا تاج سایا ان کی خوشبو شہرت عام بن کر جہان میں پھیلی اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی۔ وہ تاج سر پر رکھا گیا تو آب حیات اس پر شبنم ہوکر برسا کہ شاداب کو کمھلانے کا اثر نہ پہنچے۔ ملک الشعرائی کا سکہ اس کے نام سے موزون ہوا اور اس کے طغرائے شاہی میں یہ نقش ہو کہ اس پر ختم اردو کا خاتمہ ہا گیا چنانچہ اب ہرگز امید نہیں کہ ایسا قادر الکلام ہر ہندوستان میں پیدا ہو۔"[1]

اس شاعر کا اس انداز میں تعارف کرایا جائے اس کے کلام کی عظمت اور ہر دلعزیزی کے بارے میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آزاد استاد کی تعریف اپنے مخصوص انداز میں کرتے کرتے مبالغے سے بھی کام لیتے گئے۔ متاخرین شعرا کے بیان میں

۱۔ آب حیات ص ۴۰

آزاد نے "آبحیات" میں سب سے زیادہ جگہ ذوق کو دی ہے اور لازمی طور پر ان کی زندگی اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ ذوق کی شاعری اور ان کی غزلوں پر تبصرہ ملتا رہی ہے۔ لیکن وہ استاد کے کلام پر تنقید پر تیار ہوئے اور بہ عقیدت سے سرشار نظر آتے ہیں۔ "ذوق کی غزل گوئی کی خصوصیات تازگی مضمون، صفائی نظم، چستی و تراکیب، خوبی محاورہ اور عام فہمی ہے۔" آزاد کا قول ہے کہ مختلف وقتوں میں ذوق کے کلام کا رنگ مختلف رہا چنانچہ ابتدا میں ان پر مرزا رفیع سودا کا اثر غالب تھا لیکن ان کے یہاں وہی منزل شرحیں، چست بندش ہیں اور برجستہ ترکیبیں پائی جاتی ہیں۔ اس دور کے بعد انہی بخت خان معروف اور ولی عہد کی صحبت سے کلام کا انداز بدلا چنانچہ اس دور میں ذوق کی غزلوں پر جرات، انشا اور مصحفی کا رنگ واضح ہے۔ آزاد کہتے ہیں کہ

"ان کی غزل آخر تو اپنے گلدستہ گلہائے رنگا رنگ کی ہوتی تھی۔ دو تین شعر بلند خیالی کے، ایک دو تصوف کے، دو تین معاملے کے، اور یہ اس میں یہ ہوتا تھا کہ ہر قافیہ بھی ایسا خاص انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتا ہے کہ اس میں بندھے تو لطف دے نہیں تو پھیکا رہے یہی وہ مضمون باکمال اس بات کو پورا پورا سمجھا ہوا تھا۔"[1]

اب اس ہے کہ ذوق اوسط درجے کے غزل گو شاعر تھے مگر دربار کی سرپرستی نے انہیں ملک الشعرا بنا دیا۔ وہ میر، مرزا، درد، مصحفی، انشا اور جرات کے خوشہ چین تھے مگر انداز بیان سلیس اور دلنشین تھا لہذا شاعروں میں بڑی واہ واہ ہوتی تھی۔ "آبحیات" لکھتے وقت آزاد نے ان غزلگو شعرا کو اپنے زور بیان اور شیرین کلام سے بہت اعلیٰ رتبہ دیا ہے ان میں ذوق سرفہرست ہیں۔ وہ استاد کے کلام کا معروضی جائزہ نہیں لے سکے تھے چنانچہ غزل کی تنقید میں تاثراتی انداز سب سے پہلے آزاد نے اختیار کیا۔

۱۔ آبحیات ص ۴۵۲

مثال کے طور پر ذوق کے انداز کلام پر آزاد کی کل افشانی ملاحظہ ہو ۔

" کلام پر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مضامین پر ستارے آسمان میں سے اتارے ہیں مگر اپنے لفظوں کی ترکیب سے انہیں ایسی شان و شکوہ کی کرسیوں پر بٹھایا ہے کہ پہلے سے بھی اونچے نظر آتے ہیں ۔ انہیں قادر الکلامی کے دربار سے ملت سخن پر حکومت مل گئی ہے کہ ہر قسم کے خیال کو جس رنگ سے چاہتے ہیں کہہ جاتے ہیں ۔ کبھی تشبیہ کے رنگ سے کبھی استعارہ کی بو سے بساتے ہیں کبھی بالکل سادے لباس میں جلوہ دکھاتے ہیں مگر ایسا کچھ کہہ جاتے ہیں کہ دل میں نشتر سا کھٹکتا ہے اور منہ سے کبھی واہ نکلتی ہے اور کبھی آہ نکلتی ہے ..... انہیں اس بات کا کمال تھا کہ باریک سے باریک مطلب اور پیچیدہ سے پیچیدہ مضمون کو اس صفائی سے ادا کرتے ہیں گویا ایک شربت کا گھونٹ تھا کہ کانوں کے رستہ سے پلا دیا ہے اس وصف نے دانوں کو غلطی میں ڈالا ہے وہ کہتے ہیں کہ ان کے ہاں عالی مضامین نہیں بلکہ سیدھی باتیں اور صاف صاف خیالات ہوتے ہیں وہ نہیں جانتے کہ ان موتیوں میں خدا نے عجیب تاثیر دی تھی کہ جو لفظ ان سے ترکیب پا کر نظم میں خود بخود زبانوں پر ڈھلکتے آتے ہیں جیسے پیشم پر موتی "[1]

آزاد کی شاعرانہ تنقید اور تاثراتی انداز بیان کے ہیں ذوق کا بڑے سے بڑا مخالف بھی مسحور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا یہ واقعہ ہے کہ آزاد نے مومن اور غالب کے ساتھ وہ انصاف نہیں کیا جو ان کا حصہ تھا لیکن ذوق کو انہوں نے اردو شاعری میں وہ مقام دیا جس کے شاید وہ مستحق نہیں تھے ۔

۱۔ آب حیات ، ص ۴۵۵

پانچویں دور کے شعرا میں آخری تبصرہ نظام الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خان غالب کا ہے۔ آزاد نے غالب کی زندگی کے حالات، ان کی شخصیت، طبعی عادات پر مخصوص انداز میں روشنی ڈالی ہے اس کے علاوہ فارسی تصنیفات کا بھی مختصر ذکر کیا ہے۔ اردو میں صرف یادگار میں لکھتے ہیں کہ غالب کے تقریباً "اٹھارہ" اشعار کا منتخب دیوان ہے جو مرتب ہوکر ۱۸۴۹ء میں شائع ہوا مرزا کے کلام پر تبصرہ بے حد مختصر ہے۔

"اس میں کلام نہیں کہ وہ اپنے فن کی تاثیر سے مضامین و معانی کے
بیشہ کے شیر تھے۔ دو باتیں ان کے انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں
اول یہ کہ معنی آفرینی اور نازک خیالی ان کا شیوہ خاص تھا۔ دوسرے
چونکہ فارسی کی مشق زیادہ تھی اور اس سے انہیں طبعی تعلق تھا اس لئے
اکثر الفاظ اس طرح ترکیب دے جاتے تھے کہ بول چال میں اس طرح بولتے
نہیں لیکن وہ صاف صاف نکل گئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں رکھتے"[1]

حیرت ہوتی ہے کہ آزاد جیسے وسیع المشرب اور عالی ظرف مورخ و نقاد نے غالب کا کام چند سطروں میں تمام کر دیا۔ ہم یہ ماننے کو تیار نہیں کہ آزاد غالب کے کلام کی خوبیوں سے واقف نہیں تھے۔ یہ بات بھی قرین قیاس نہیں کہ وہ محض ان کی مشکل پسندی اور فارسیت کی بنا پر انہیں روا روی میں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ نفسیاتی طور پر اس کے دو اسباب ہوسکتے ہیں ایک تو یہ کہ آزاد جو عقیدت میں اپنے استاد کو غالب سے بڑا شاعر سمجھتے تھے اور اس کا واحد معیار صفائی بیان، سلاست کلام اور روز مرہ و محاورہ کا موزوں استعمال ہے۔ اگرچہ وہ ذوق کے کلام کی ظاہری حسن پر فریفتہ تھے مگر انہوں نے اس کلام کی سطحیت اور روایتی مضامین کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ برخلاف اس کے غالب کا کلام "گنجینۂ طلسم معانی" ہے۔ اس کو اگر خرنا آزاد مصلحتاً" ضروری نہیں سمجھتے تھے دوسری بات

۱۔ آب حیات، ص ۴۹۵، ۴۹۶

و آزاد کی غالب پر سلسلہ میں تنقید کے متعلق کہی جاتی ہے وہ یہ کہ شاید اسی دور میں اردو تنقید کے اس وہ ذخیرہ لفظی نہیں تھا جس سے غالب پر کلام پر ساتھ انصاف کیا جاسکے۔ چنانچہ آزاد نے بھی چند مخصوص معیاروں کی بنا پر ان کے کلام کا تجزیہ کیا ہے لیکن آزاد کا غالب کی غزلوں کا انتخاب اتنی کہ بے مثل ہے اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان کا ادبی معیار بے حد تربیت یافتہ اور رچا ہوا تھا۔ بعد کے بعد اردو نقادوں نے آزاد کی "آب حیات" کو مغربی معیار پر رکھنے کی کوشش کی اور ان پر نقائص پر روشنی ڈالی۔ ایسے نقادوں کی بھی کمی نہیں نہیں و آزاد کو ہر طرح سے غلطیوں سے آزاد کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی آزاد کے مداحوں میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے آزاد کی ادبی خدمات کا والہانہ انداز میں اعتراف کیا ہے کہ

"حضرت آزاد نے کوئی بات بغیر تحقیق کئے ہوئے نہیں لکھی اور جو اعتراضات ان پر کئے گئے ہیں وہ زیادہ تر بدگمانی، کم علمی اور تنقید نظری کا نتیجہ ہے۔"[1]

اس کے باوجود انہوں نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ آزاد کے بیشتر بیانات کتابوں سے ماخوذ ہیں اور انہوں نے حسن سنائی باتوں کو بھی اپنی کتاب میں درج کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں تحقیق کے اصول و ضوابط کچھ زیادہ متعین نہیں تھے لہذا آزاد نے بھی اکثر مقامات پر اپنے ماخذوں کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

"آب حیات" تحقیقی و تنقیدی خامیوں کے باوجود اردو تنقید بالخصوص غزل کی تنقید کا اوّلین نمونہ ہی نہیں بلکہ شاہکار بھی ہے۔ آزاد نے جس محنت اور دقت نظر سے یہ کتاب تصنیف کی وہ سب پر عیاں ہے۔ بیسویں صدی میں اردو شاعری کی تاریخ اور غزلگو شعرا پر جتنی کتابیں منظر عام پر آئیں لیکن حق تو یہ ہے کہ کسی کو بھی نہ تو "آب حیات" کے نقوش پر لکھنے کی توفیق ہوئی اور نہ کوئی آزاد کی مخصوص طرز نگارش میں ان کا ہمسر

۱۔ سید مسعود حسن رضوی، "آب حیات کا تنقیدی مطالعہ" ص ۷۲ ، ۷۵

پیدا ہوا ۔ غزل کی تنقید کے ابتدائی نقوش اتنی بھرپور باذ بہت پر ساتھ "آبحیات" میں موجود ہیں ۔ بعد میں دیگر نقادوں نے آزاد سے خوشہ چینی کی اور ان کی خوردہ گیری بھی کی لیکن اس لازوال تصنیف کی جو اہمیت اور مقبولیت میں کوئی کمی نہیں ہوسکی ۔ آزاد نے اپنے دور تک تمام قدیم و جدید غزلگو شاعروں کی لسانی و شعری خدمات کا نہ صرف اعتراف کیا ہے بلکہ ان کے کلام کے عارضی اور دائمی عناصر کی بھی نشاندہی کی ہے ۔ اس لحاظ سے "آبحیات" کی انفرادیت مسلم ہے ۔ سید وقار عظیم نے بالکل صحیح کہا ہے ۔

> " ..... "آبحیات" اردو شاعری کے ارتقا کی ایسی تنقیدی دستاویز اور اس پر بڑھ کر ایک ایسا صحیفہ ہے جس میں زندگی کی ہلچل گہما گہمی ہلچل اور تڑپ بھی ہے اور اس کی اندرونی روح بھی ۔"[1]

۱۔ سید وقار عظیم ، " تنقید آزاد اور اس کا مخصوص مزاج " مشمولہ آبحیات کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ ، مرتبہ سید ۔ اد ، ص ۷

الطاف حسین حالی اور مقدمۂ شعر و شاعری

خواجہ الطاف حسین حالی

حالی کا دور جدید اردو تنقید کا پہلا دور ہے کیونکہ اس سے قبل ادبی جائزے اکثر و بیشتر تبصروں اور تذکروں کی شکل میں ہوتے تھے اور ان میں تنقید کی بصیرت سے زیادہ شخصی حالات اور ذاتی تاثرات ہوتے تھے۔ ان تذکروں میں تنقید کہیں تو تعریف و تحسین اور دیدہ نگاری کی نثری شکل معلوم ہوتی ہے یا محض تعریف و تنقیص و کبھی کبھی ہجو کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ عموماً تذکرہ نگار ذاتی واقفیت یا سنی سنائی باتوں کی بنا پر شاعروں و ان کی زندگی و شخصیت اور ان کی پسند و ناپسند اشعار کے پیمانے سے انجام دیتے تھے۔ اسلوب بیان رنگین شاعرانہ اور پرتکلف ہوتا تھا اور لفاظی و عبارت آرائی میں مطلب کی بات گم ہو کر رہ جاتی تھی۔ میر کے "نکات الشعرا" سے لے کر لالہ سری رام کے "خمخانۂ جاوید" تک ہماری تنقید کی کائنات یہی تھی۔ اگرچہ آزاد کو "انگریزی لٹریچر کی روشنی" کی خبر ہو چکی تھی اور وہ فن تنقید میں جدید انداز اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں لیکن ذاتی مزاج اور افسانوی میلان اور جدید اصول تنقید سے ناواقفیت کی بنا پر وہ تنقید کا حق ادا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کی "آب حیات" یقیناً تذکرہ نگاری کا نیا رویہ ہے اور انشا پردازی کی بنیاد پر دلکش بھی ہے اور معلوماتی بھی۔ یہ تصنیف گذشتہ تذکرہ نگاروں کے مقابلے میں زیادہ تنقیدی عناصر کی حامل ہے۔

حالی اردو میں جدید تنقید کے بانی ہیں انہوں نے سب سے پہلے قدیم طرز تحریر کو انحراف کیا اور مشرقی و مغربی تنقیدی اصول کو مدنظر رکھ کر اردو شاعری کے نظریہ اور اس کے مختلف اصول و اسالیب مرتب کئے۔ حالی کو غالب اور سرسید جیسے مشاہیر کی صحبت ملی اور کچھ ذاتی میلانات کی باعث وہ اردو نثر کو راستے پر ڈالنا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے آزاد اور شبلی کے مقابلے میں زیادہ شدید کی سے مغربی ادبیات سے اثر قبول کیا۔

اگرچہ انھیں انگریزی زبان سے کوئی واقفیت نہیں تھی لیکن انھوں نے کرنل ہالرائیڈ اور دوسرے انگریزوں کی صحبتوں سے پورا فائدہ اٹھایا اور اپنے محدود نثرِ علم کی روشنی میں مغربی تنقیدی معیار کو قائم رکھتے ہوئے اردو شاعری کے لئے نیا نصاب قائم کیا ۔ کلیم الدین احمد کا قول ہے کہ حالی انگریزی کی ناواقفیت کے باوجود بحرِ بیکراں میں کود پڑے لیکن ہمارے نزدیک حالی کی یہ جرأت مندی آج بھی سبک ساران ساحل کے لئے تازیانہ عبرت ہے ۔

" مقدمہ شعر و شاعری " اردو تنقید میں اب تک شاہکار کا حکم رکھتا ہے ۔ اگرچہ حالی تنقیدی رنگ میں انھوں نے مقدمہ کے بعد کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن " حیاتِ سعدی " " یادگارِ غالب " اور " حیاتِ جاوید " سوانحی کے ساتھ تنقیدی بھی ہیں اس لئے حالی کی تنقید نگاری میں ان کا مطالعہ ناگزیر ہے ۔ " حیاتِ سعدی " تاریخی اعتبار سے پہلی کتاب ہے اور مقدمہ اس کے بعد لکھا گیا ۔ " یادگارِ غالب " مقدمہ کے بعد کی اور " حیاتِ جاوید " آخری تصنیف ہے ۔ " حیاتِ سعدی " اور " یادگارِ غالب " کے درمیان " مقدمہ " آتا ہے ۔ اس سے غالب کی تنقید میں حالی نے سعدی کے مقابلے میں زیادہ گہری نظر اور وسعتِ خیال کا ثبوت دیا ہے ۔

" مقدمہ شعر و شاعری " کی حیثیت نہ صرف حالی کی تمام تصنیفوں میں بلکہ بیسویں صدی کے اردو تنقیدی سرمایہ میں یادگار ہے ۔ حالی کے ذہن میں فنِ شعر سے متعلق نظریات اور خیالات ایک عرصے سے تشکیل ارہے تھے اور جن کا اظہار " حیاتِ سعدی " میں ابھرا ہوجاتا تھا وہ مدلل اور مربوط طور پر " مقدمہ " میں ظاہر ہوئے ۔ " مقدمہ " ہمارے نزدیک اردو شاعری کا " پوئیٹکا " (POETICS) ہے ۔ جس طرح ارسطو نے اپنے عہد کی مروجہ اصناف سخن المیہ ، رزمیہ اور غنائیہ پر اظہار رائے کرتے ہوئے ہر صنف کی بنیادی خصوصیات اور شعری کیفیات پر بحث کی ہے اور عام شاعری کے اصول مرتب کئے اسی طرح حالی نے اردو شاعری کی مروجہ اصناف غزل ، قصیدہ ، مرثیہ اور مثنوی پر نہ صرف سیر حاصل بحث کی

بلکہ ان کی اساسی خصوصیات اور سماجی اہمیت سے بھی ہمیں آگاہ کیا اس سلسلے میں انہوں نے فن شعر اور اس کے لوازمات کا بھی اندازہ لیا ۔ اور مغربی ادب سے بصیرت حاصل کرتے ہوئے مشرقی ادب بالخصوص فارسی اور عربی سے مثالیں پیش کرکے اپنا نقطۂ نظر واضح کیا ۔ " مقدمہ شعر و شاعری " میں پہلی دفعہ نظریاتی اور عملی تنقید کا یہ بیک وقت حق ادا کیا گیا ہے ۔

ابتدا میں حالی نے اپنے کلام کے بعض لغزش کے طور پر چند صفحات شعر و شاعری پر رقم کئے تھے لیکن مضمون کی اہمیت اور اصلاح کے جذبے نے انہیں اس موضوع کو مزید اضافے کی ترغیب دی ۔ چنانچہ موجودہ شکل میں یہ مضمون پوری کتاب کی حیثیت رکھتا ہے ۔ اور ایک مستقل شاہکار نامہ ہے ۔ ارسطو نے " پوئیٹکا " اپنے استاد افلاطون کے اس نظریے کی تردید میں لکھی کہ شاعری ناقص فن محاکاتی ہے اور یہ ثابت کیا کہ شاعری ایک تخلیقی فن ہے جو میں واعی اور امکانی امتزاج حسین اور دلپذیر انداز میں ہوتا ہے ۔ حالی کے سامنے دور کا مسئلہ تھا ۔ اردو شاعری نہ صرف قدما اور متوسطین کے بعد رو بہ زوال تھی بلکہ اس میں ترقی کے امکانات ختم ہوتے جا رہے تھے ۔ اور لوگ غزل کی شاعری دلکشی پر سر دھنتے تھے ۔ انگریزی ادب کا اثر بالخصوص اردو شاعری پر پڑنے لگا لیکن روایتی شکنجے کی وہ سیر دستخوش تھی ۔ اس لئے حالی نے بیمبرانہ جرأت کے ساتھ مردہ ماضی اور غلط روایت پرستی کے خلاف آواز اٹھائی ۔ اس اعتبار سے "مقدمہ " تعمیری تنقید کا ایک عمدہ نمونہ ہے لیکن جذبۂ اصلاح کے غلبہ نے کہیں کہیں حالی کو اپنی شاعری سے بھی بد ظن کر دیا ہے ۔

" مقدمہ شعر و شاعری " کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ۔ پہلے حصے میں نظری تنقید ہے جو میں بنیادی امور یعنی شعر کی اہمیت ، تاثیر ، شاعری اور اخلاق کا تعلق شعر کی ماہیت اور شاعری کے لازمی شرائط پر بحث کی گئی ہے ۔ دوسرے حصے میں

اردو شاعری کے مختلف اصناف پر مبسوط بحث اور اصلاح کے مشورے ملتے ہیں۔

حالی نے "مقدمہ" کی ابتدا شعر کی مدح و ذم سے کی ہے اور اس سلسلے میں شاعری کے مخالفین بالخصوص اس دبستان کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے کہ شعر جہل و تاریکی کے زمانہ کی پیداوار ہے۔ جدید دور سائنس اور عقلیت کی وجہ سے شاعری کے لئے زیادہ سازگار نہیں مگر حالی نے شاعری کی حمایت بڑے اعتماد اور قوی انداز میں کی ہے ان کے نزدیک شعر کی تاثیر بہر صورت مسلم ہے اور تاریخ میں ایسی مثالیں موجود ہیں جب شاعروں نے اپنی ادبی بیانی سے لوگوں کے دلوں پر فتح حاصل کی۔ حالی کہتے ہیں کہ یورپ میں ونیشیکل مشکلات کے وقت قدیم دور سے شاعری کو قوم کی ترغیب و تحریص کا ایک زبردست آلہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ "مقدمہ" کے ابتدائی حصوں میں اکثر اوقات حالی مختلف تنقیدی نکات کو گڈمڈ کر دیتے ہیں وہ شاعری کا ملکہ، شعر کی تاثیر اور اس کے حسن قبول کے سلسلے میں اکثر اوقات بے ربط بحث میں الجھ جاتے ہیں۔ میدان جنگ میں پڑھے جانے والے رزمیہ یا انقلابی قسم کی نظمیں سیاسی اعتبار سے اہم سہی لیکن اعلیٰ شاعری میں ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ انگلستان کے بادشاہ ایڈورڈ کے ویلز پر حملہ کرنے کی داستان پر بائرن کا "چائلڈ ہیرلڈ" یا عربی شاعر اعشیٰ کی مثال کلاسیکی ادب نہیں۔ خالی اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لئے حکایات کا سہارا لیتے ہیں ایرانی شاعر رودکی کے کلام کا اثر اور نور بانی کاشن کی حکایت تنقید نہیں ہے۔

خاص دور جدید میں شاعری کے بارے میں قدیم تصورات پر ہیں۔ یا تو وہ محض تاریخی طور پر شاعری کی اہمیت ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں یا ان کو یہ احساس نہ ہوسکا کہ اعلیٰ سائنس سے یکسر مختلف نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری بھی سائنس کی طرح انسان کی بہترین دماغی تحریکات کا آئینہ ہے اور اس سے مادی سکون کے بجائے قلبی سکون اور روحانی سرور ملتا ہے۔ سائنس صرف کائنات کی خارجی ہیئت کا تجزیہ کرتی ہے لیکن شاعری خارجی اور داخلی دونوں پر حاوی ہے۔

حالی " مقدمہ " میں شاعری کی اخلاقی قدروں کے بڑے حامی ہیں۔ ان کا قول ہے کہ شعر کا اثر محض عقل کے ذریعے سے نہیں بلکہ زیادہ تر ذہن و ادراک کے ذریعے سے اخلاق پر ہوتا ہے۔ ہر قوم اپنے ذہن کی جودت اور ادراک کی بلندی کے موافق شعر سے اخلاق فاضلہ اکتساب کرسکتی ہے۔ حالی کا خیال اپنے حد تک صحیح ہے کہ شاعری سے اخلاق اور معاشرت کو سدھارنے کا کام لیا گیا لیکن " وسیلہ قرب الٰہی اور باعث تصفیہ نفس و تزکیہ باطن " ہونے کے ساتھ ساتھ شاعری انسانی احساسات و جذبات کا آئینہ دار بھی رہی ہے جس میں عشق و عاشقی کو اتنا ہی دخل رہا جتنا اخلاق و معرفت کو۔ بہرحال اس میں کلام نہیں کہ ابتدائی زمانہ میں شاعری جب فطری صداقت پر مبنی تھی اور محض بادشاہوں کی خوشنودی یا انعام و اکرام کی خاطر نہیں لکھی جاتی تھی تو اس میں زیادہ زور و شور ہوتا تھا برخلاف اس کے متاخرین کی شاعری حالی ہی کی زبان میں " شعر و شاعر کا ناپاک دفتر ہوکر رہ گئی " ۔ فی زمانہ شاعری دربار کے توسط اور ادنیٰ درجہ شاعروں کے ہاتھوں ناقابل اصلاح حد تک زوال پذیر تھی ہے۔ اور اسے سائنس اور جدید علوم سے بھی خطرہ ہے لیکن حالی اس صورتحال سے ناامید نہیں۔ ان کے نزدیک سائنس اور مادی علوم اگرچہ ہمارے جذبات اور احساسات کو مردہ کرنے پر تلے ہیں لیکن ان کی بدولت شاعر کے لئے نئی نئی تشبیہات اور تمثیلات کا بے زوال ذخیرہ بھی مہیا ہوسکتا ہے اس لئے ان کو شاعری کا مستقبل روشن نظر آتا ہے۔

" جب تک عشق انسان کے دل پر حکمران ہے اور ہر فرد بشر کی روداد زندگی کو دلچسپ قصہ بنا سکتا ہے۔ جب تک قوموں میں حب وطن کا جوش موجود ہے۔ جب تک بنی نوع انسانی ہمدردی پر متفق ہوکر عامل ہونے کے لئے حاضر ہیں اور جب تک حوادث اور وقائع جو زندگی میں وقتاً بعد وقت حادث ہوتے ہیں۔ خوشی یا غم کی سلسلہ جنبانی کرتے رہیں گے تب تک اس بات کا خوف نہیں ہوسکتا کہ تخیل کی طاقت کم ہوجائے گی

اور اس پر بھی کم خوف اس بات کا ہے کہ جب تک کہ نیچر کی کان کھلی ہوئی ہے شاعر اذخیرہ نہیں پائیگا "[1]

حالی تو شاعری کی وسعتوں اور خوبیوں کا احساس ہے۔ وہ محض روایتی و تقلیدی شاعری اور اس کی بندشوں کے مخالف ہیں۔ ان کا مقصد سوائے اس کے کچھ اور نہیں کہ شاعری کو حقیقت اور واقعیت سے قریب لاکر اسے فطرت کی ترجمانی کا آلہ بنایا جائے۔ اس لئے مبالغہ و اغراق تخیل کی بے راہ روی اور ذہن کی بد دماغی انہیں کبھی گوارا نہیں۔ معنوی حیثیت سے قطع نظر وہ اردو شاعری میں شعر کو قافیہ و ردیف کی زنجیروں سے بھی آزاد کرنا چاہتے ہیں ان کا یہاں بات یہ ہے کہ شعر و نظم میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ شعر ایک کیفیت و ایک احساس اور تاثر کا لفظی پیکر ہے مگر نظم (VERSE) چند بیانات و روایات کی پیروی بھی رکھتی ہے۔

" مقدمہ شعر و شاعری " کی اہمیت ہمارے لئے یوں بھی بڑھ جاتی ہے کہ حالی نے اس میں شعر کی ماہیات اور معاشرت پر اس کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ وہ شعر کی ماہیت اور شاعری میں بنیادی خوبیوں سے جب بحث کرتے ہیں تو ان کی نظر میں اردو شاعری کی اہم ترین صنف غزل ہی ہے۔ جو بیک وقت سب سے ممتاز اور مقبول بھی ہے اور سست و مطعون بھی چنانچہ ہمیں غزل پر حالی کے تاثرات یا تنقیدی نظریات مرتب کرنے سے پہلے ان کے عام شعری نظریات سے واقفیت ضروری ہے اس لئے کہ انہیں معیاروں پر وہ اعلیٰ شاعری خصوصاً " غزل پر محاکمہ کرتے ہیں۔

" مقدمہ " کا سب سے اہم باب شعر کی ماہیت اور شاعری کے لئے اہم شرائط سے بحث کرتا ہے۔ شعر کی ماہیت پر حالی اپنی کوئی رائے پیش نہیں کرتے اور نہ اس کی اصلیت اور سرچشمہ و غایت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ انگریزی سے ناواقفیت کی وجہ سے وہ مکالمے جیسے دوم درجے کے مصنف کا حوالہ دیتے ہیں جو نہ بہت بڑا انداز تھا اور نہ ناقد۔ وہ

۱۔ خواجہ الطاف حسین حالی ، مقدمہ شعر و شاعری ، مرتبہ وحید قریشی ، ص ۹۲

میکالے کا قول دہراتے ہیں کہ شاعری بھی دیگر فنون کی طرح ایک فن لطیف ہے۔ اور ایک حد تک مصوری و بت تراشی اور نقاشی سے مشابہ ہے لیکن اشیاء خارجی کی نقل میں یہ تینوں فنون کا کام دے سکتی ہے۔ اس سلسلے میں میکالے کا سب سے اہم اقتباس درج ذیل ہے۔

" شاعری کائنات کی تمام اشیائے خارجی اور ذہنی کا نقشہ اتار سکتی ہے۔ عالم محسوسات، دولت کے انقلابات، سیرت انسانی اور معاشرت نوع انسانی تمام چیزیں جو فی الحقیقت موجود ہیں اور تمام وہ چیزیں جن کا تصور مختلف اشیاء کے اجزا کو ایک دوسرے سے ملا کر کیا جا سکتا ہے سب شاعری کی سلطنت میں محصور ہیں۔ شاعری ایک سلطنت ہے جس کی قلمرو اس قدر وسیع ہے جس قدر خیال کی قلمرو "۔[1]

مشہور انگریزی مصنف سر فلپ سڈنی نے شاعری کو " علم انسانی کی دایہ " بتایا ہے۔ ورڈس ورتھ شاعری کو " شدید احساسات کا بے تکلف اظہار " سمجھتا ہے۔ شیلی " تخیل کا اظہار " کو شاعری کہتا ہے اور کارلائل کے نزدیک شاعری " مترنم خیال " کے علاوہ کچھ نہیں۔ ان تمام اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ شاعری موزوں اور پر ترنم الفاظ میں دلی جذبات کا اظہار ہے۔ اور اس کے مزاج میں خارجی حقائق اور داخلی واردات کو یکساں طور پر دخل ہے۔ مصوری یا نقاشی سے محض ذوق دید کی تشفی ہو سکتی ہے لیکن شاعری " جنت نگاہ " و " فردوس گوش " کے علاوہ بھی اور بہت کچھ ہے۔ ہماری دماغی اور روحانی تسکین کا جو سامان شاعری فراہم کر سکتی ہے وہ دوسرے اصناف سے بہت مشکل ہے۔

شعر کی ماہیت سے بحث کرنے کے بعد حالی نے دوسرا اہم سوال شعری لوازمات کے تحت اٹھایا ہے اور شاعری کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک تخیل، مطالعہ، کائنات اور تجربہ انسانی اعلیٰ شاعری کے بنیادی لوازم ہیں۔

۱۔ خواجہ الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری، مرتبہ وحید قریشی، ص ۱۰۹، ۱۱۰

(الف) تخئیل ـ

بقول حالی کے یہ وہ ملکہ ہے جو فطری ہوتا ہے اور شاعر کو غیر شاعر سے ممتاز کرتا ہے۔ اگر شاعر کے یہاں یہ ملکہ موجود ہے تو دوسری شرطون کی کمی پوری کی جاسکتی ہے یہ وہ طاقت ہے جس سے شاعر اپنے خیالات اور احساسات کا اظہار کرتا ہے ـ

" یہ وہ طاقت ہے جو شاعر کو وقت اور زمانہ کی قید سے آزاد کرتی ہے ـ اور ماضی و استقبال اس کے لئے زمانہ حال مین کھینچ لاتی ہے ـ وہ آدم اور بنت کی سرگزشت اور حشر و نشر کا بیان اس طرح کرتا ہے کہ گویا اس نے تمام واقعات اپنی آنکھ سے دیکھے ہین "ـ[1]

تخئیل کے متعلق حالی کا یہ نظریہ بہت حد تک صحیح ہے اگرچہ وہ مغربی نقادون سے زیادہ واقف نہین تھے لیکن بحیثیت شاعر وہ جبلی طور پر محسوس کرتے ہین کہ

" قوت متخئیلہ تصورات اور خیالات مین بھی تصرف کرتی ہے اور الفاظ و عبارات مین بھی "ـ[2]

یہ ایک اہم تنقیدی نکتہ ہے ـ تخئیل محض محاکات یا نقالی نہین بلکہ تخئیلی عمل کا سرچشمہ ہے ـ اس سلسلے مین حالی نے ایک اور بڑے کی بات کہی ہے کہ تخئیل کو قوت ممیزہ کا محکوم رکھنا چاہئے ـ " قوت متخئیلہ ہمیشہ خلاقی اور بلند پروازی کی طرف مائل رہتی ہے مگر ممیزہ اس پرواز کو محدود کرتی ہے ..... دنیا مین جتنے بڑے بڑے شاعر ہوئے ہین ان مین قوت متخئیلہ کی بلند پروازی اور قوت ممیزہ کی کومت دونون ساتھ ساتھ پائی جاتی ہے

(ب) مطالعہ کائنات ـ

شاعری مین کمال حاصل کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ کائنات اور فطرت انسانی کا

۱ـ حوالہ الطاف حسین حالی مقدمہ شعر و شاعری ، مرتبہ وحید قریشی ، ص ۱۱۳
۲ـ ایضاً ص ۱۱۴

بغور مطالعہ کیا جائے۔ شاعر کے لئے ضروری ہے کہ جو امور اس کے مشاہدہ میں آئیں انہیں ترتیب دینے کی عادت ڈالے اور اس سرمایہ کو اپنی یاد کے خزانے میں محفوظ رکھے۔ اس میں شک نہیں کہ زندگی کے تجربے اور مشاہدے شاعر کے یہاں جتنے گہرے ہونگے اس قدر اس کے کلام میں آفاقیت اور فکری رنگ بھی نمایاں ہوگا۔ مطالعۂ کائنات کی حد تک حالی نے شاعر کے لئے تخیل، حافظہ، غور و فکر اور حواس خمسہ سے کام لینے کی تلقین کی ہے یعنی بغیر انسانی فطرت کو سمجھے بوجھے کوئی شاعر آفاقی حیثیت نہیں حاصل کرسکتا لیکن مطالعے کی دوسری زبردست صورت ان کے زیر بحث نہیں۔ شاعر کو تاریخ، فلسفہ، عمرانیات یا سماجیات اور دیگر علوم کی بھی کچھ اندازی ہو تو بہتر ہے۔ شاعری میں دستاویز بوقلمونی کے لئے مطالعۂ کائنات اور مطالعۂ کتب یکساں طور پر لازم ہیں۔

(ب) تفحص الفاظ۔

حالی کے نزدیک شاعری کے لئے تیسری شرط الفاظ کی چھان بین اور موزوں انتخاب ہے۔ الفاظ کے صحیح متناسب استعمال اور انتخاب سے شعر میں ان بڑھاتی ہے وہ لکھتے ہیں ــــ

"شعر کی ترتیب کے وقت اول متناسب الفاظ کا انتخاب کرنا اور پھر ان کو ایسے طور پر ترتیب دینا کہ شعر سے معنی مقصود کو سمجھنے میں مخاطب تردد باقی نہ رہے اور خیال کی تصویر ہو بہو آنکھوں کے سامنے پھر جائے اور باوجود اس ترتیب میں اپنے بادو مخفی ہو جو مخاطب کو مسحور کرلے۔"[1]

الفاظ کے انتخاب کے سلسلے میں حالی نے یہ بات بڑے پتے کی کہی ہے کہ نافص شاعر معمولی سے معمولی الفاظ پر قناعت کرلیتا ہے لیکن بڑا شاعر سب تک زبان کے تمام کنویں نہیں چھان لیتا اسے چین نہیں ملتا۔

۱۔ حوالہ الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری، ص ۱۱۹

" شعر کی ماہیت " اور شعری لوازمات پر اظہار خیال کے بعد حالی اپنے مقدمہ میں عمدہ شاعری اور اس کی خصوصیات سے بحث کرتے ہوئے نیچرل شاعری کا معیار قائم کرتے ہیں۔ کچھ تو مغربی شاعری کے ساتھ عقیدت اور کچھ مشرقی روایتی شاعری سے بیزاری کے باعث انہوں نے قدیم معیار تنقید شعری سے انحراف کیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ تمام اصناف سخن بالخصوص غزل بری طرح روایات کے شکنجے میں گرفتار ہے اور زمانہ کا ساتھ دینے سے قاصر ہے۔ چونکہ سرسید کی علی گڑھ تحریک کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اردو زبان و ادب کو قومی و معاشرتی اصلاح کا ذریعہ بنایا جائے لہذا حالی نے اردو شاعری کو عموماً اور غزل کو خصوصاً تنقید نیز ترک الغیر کی کوشش کی۔ حالی نے تنقیدی و جمالیاتی نظریات شعری میں "انتخابیت" کے اصول پر کاربند ہیں۔ وہ شعر کی افضلیت کے سلسلے میں مشرقی و مغربی نقادوں سے خوشچینی تو ضرور کسی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن تخلیق شعر اور نفس شعر کے تجزیے میں اپنی فکر رہ گئے ہیں۔ بہرحال وہ ملتن کے اس قول کو کہ

" شعر کی خوبی یہ ہے کہ سادہ ہو۔ جوش سے بھرا ہوا ہو اور اصلیت پر مبنی ہو "[1] خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

حالی کا یہ خیال صحیح ہے کہ شاعری میں الفاظ و خیال دونوں کو سلیس اور عام فہم ہونا چاہئے تعقید لفظی اور معنوی اور چستان نگاری کسی صورت میں اعلیٰ شاعری کی خصوصیات نہیں۔ حالی نے سادگی کو ایک اضافی امر بتایا ہے اور اسطرح سادہ کلام اور عامیانہ کلام میں امتیاز کیا ہے۔

" ہمارے نزدیک کلام کی سادگی کا معیار یہ ہونا چاہئے کہ خیال کیسا ہی بلند اور دقیق ہو مگر پیچیدہ اور نہ ہموار نہ ہو اور الفاظ جہاں تک ممکن ہو تحاور اور روزمرہ کی بول چال کے قریب ہوں"[2]

۱۔ جواہر الانصاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری" مرتبہ وحید قریشی، ص ۱۲۲
۲۔ ایضاً" ص ۱۳

اعلیٰ شعر کی دوسری خصوصیت اصلیت ہے۔ یعنی شعر کی خیال کی بنیاد ایسی چیز پر ہونی چاہئے جو درحقیقت کچھ وجود رکھتی ہو۔

"اصلیت پر مبنی ہونے سے یہ مراد نہیں ہے کہ ہر شعر کا مضمون حقیقت نفس الامری پر مبنی ہونا چاہئے بلکہ یہ مراد ہے کہ جس بات پر شعر کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ نفس الامر میں یا لوگوں کے عقیدہ میں یا محض شاعر کے عقیدہ میں فی الواقع موجود ہے۔ نیز اصلیت پر مبنی ہونے سے یہ بھی مقصود نہیں ہے کہ بیان میں اصلیت سے سرمو تجاوز نہ ہو"[1]

شعر کی تیسری خوبی شدت تاثر ہے۔ شاعر جس رو کی حالت میں شعر کہتا ہے سامعین کے دل میں بھی وہی رو ذبہ پیدا ہونا چاہئے۔

"جو شعر یہ مراد ہے کہ مضمون ایسے پیرایہ ساختہ الفاظ اور موثر پیرایہ میں بیان کیا جائے جس سے معلوم ہو کہ شاعر نے اپنے ارادہ سے مضمون نہیں باندھا بلکہ خود مضمون نے شاعر کو مجبور کرکے اپنے تئیں اس سے بندھوایا ہے۔"[2]

یہ وہ منکہ ہے جس سے شاعر پیرایہ ان چیزوں میں جان ڈال دیتا ہے اور غائب کو ہمارے سامنے حاضر کر دیتا ہے۔ شعر میں جوش پیدا کرنے کے لئے خواہ مخواہ زوردار لفظوں کی ضرورت نہیں یہ بھی ممکن ہے کہ الفاظ نرم اور ملائم مگر ان میں تاثیر دریا کا جوش چھپا ہوا ہو متن شعری نظریہ کی روشنی میں جب حالی اردو شاعری اور اس کے مروجہ اصناف کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کی تنقیدی بصیرت اور مخصوص نظریات کا اندازہ ہوتا ہے۔

"ہماری شاعری زیادہ تر اب دو قسم کے مضامین میں منحصر ہے۔ عشقیہ یا مدحیہ۔ عشقیہ مضامین اکثر غزل مثنوی اور قصائد کی تشبیب میں

۱۔ خواجہ الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری، مرتبہ وحید قریشی، ص ۱۲۱
۲۔ ایضاً، ص ۱۲۴، ۱۲۵

باندھے جاتے ہیں۔ اور مدحیہ مضامین زیادہ تر قصائد میں۔
سو ان تینوں، صنفوں میں شاعر کا کام یہ سمجھا جاتا ہے کہ جو
مضامین قدیم سے بندھتے چلے آئے ہیں اور جو بنتے بنتے بمنزلہ اصول مسلمہ
کے ہو گئے ہیں انہیں کو ہمیشہ بے ادنی تغیر باندھتا رہے اور ان سے سرمو
تجاوز نہ کرے۔"[1]

حالی نے اردو شاعری میں رسم پرستی اور روایت پرستی پر کاری ضرب لگائی ہے۔ وہ غزل میں
عاشق و معشوق، گل و بلبل، ساقی و پیمانہ، رند و زاہد کے مخصوص معانی کو انتہائی
محدود طور پر استعمال کرنے کو شاعری کے لئے سم قاتل سمجھتے ہیں۔ غزل میں تشبیہات و
استعارات بھی ان کے نزدیک اپنی نہایت تنگ دائرہ میں محدود ہیں۔ وہ اس بات پر ماتم
کرتے ہیں کہ اردو غزل میں محبوب اسراپا اور سامان آرائش، فطری عوامل (باغ صحرا اور
دریا وغیرہ) اور سامان غم (نالہ، آہ، فغان، قلب، جدائی، سوز، فراق اور داغ)
کو اسی گھسے پٹے انداز میں بیان کیا جاتا رہا ہے جو متقدمین کے زمانے سے چلا آیا ہے۔

حالی شاعری کے لئے سبق لتمداد، نیچر کا مطالعہ اور بھونڈے مبالغہ سے احتراز
بنیادی شرائط تصور کرتے ہیں چنانچہ نیچرل شاعری کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"نیچرل شاعری سے وہ شاعری مراد نہیں جو نیچریوں سے منسوب ہو یا خاص
مسلمانوں یا کسی قوم کی ترقی یا تنزل سے متعلق ہو۔ نیچرل شاعری
سے وہ شاعری مراد ہے جو لفظاً و معناً دونوں حیثیت سے نیچرل یعنی
فطرت یا طبیعت کے موافق ہو۔"[2]

اردو غزل میں ابتداً متقدمین نے فارسی شاعری کے زیر اثر اور اپنے مخصوص تجربات و
مشاہدات کی روشنی میں عشق و محبت کے اسباب اور دواعی نیچرل اور سیدھے سادے طور پر

۱۔ خواجہ الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری، مرتبہ وحید قریشی، ص ۱۴۴
۲۔ ایضاً، ص ۱۵۸

بیان کیے۔ مثال کے ور ان کے کلام میں معشوق کی صورت ، حسن و جمال ، نگاہ و ابرو اور ناز و انداز بالکل فرضی معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے بعد لوگوں نے انھیں باتوں کو مجاز اور استعارے کے پیرایہ میں بیان کرنا شروع کر دیا۔ مثلاً نگاہ و ابرو یا غمزہ اور ناز و ادا کو مجازاً تیغ و خنجر کے ساتھ تعبیر کیا۔ اس جدت سے مضمون لطیف تر ہوگیا لیکن متاخرین کے لئے کچھ کہنے کو باقی نہ رہا۔ جب انھیں کوئی استعارہ ہاتھ نہ آیا تو وہ مجازی معنی کے بجائے تیغ و خنجر سے اصل تلوار مراد لینے لگے۔ اگلوں نے معشوق کو اس لئے کہ وہ گویا لوگوں کا دل شکار کرتا ہے مجازاً صیاد باندھا مگر آخری دور کے شاعروں نے اس پر سچ مچ صیاد کے تمام احکام مرتب کر دیے۔ اسی طرح متقدمین شاعروں نے روحانی محبت اور عشق الٰہی کو مجازاً شراب کے نشے سے تعبیر کیا تھا لیکن مدرسۂ لکھنؤ کے شعرا اور دہلی کے کئی متاخرین شاعروں کے یہاں شراب اور اس کے تمام لوازمات اپنے حقیقی معنوں میں استعمال ہونے لگے اسی طرح آخری دور کے شاعروں نے ہر مضمون کو جسے اس کے پیشروؤں نے فطری طور پر باندھا تھا فطرت کی سرحد سے ایک دوسرے عالم میں پہنچا دیا۔

حالی کو اس امر کا شدت سے احساس ہے کہ نیچرل شاعری کے لئے خیالات ، محسوسات اور محاکات میں جدت ہونی چاہئے یہی نہیں بلکہ زبان میں بھی اتنی وسعت پیدا کرنی چاہئے کہ نئے تصورات کو بخوبی شعر کا جامہ پہنایا جا سکے۔ وہ اہل دہلی اور اہل لکھنؤ کو تنبیہ کرتے ہیں کہ اگر انھوں نے اپنی زبان کی خبر نہ لی اور اس کے زبان و محاورات کو نہایت احتیاط کے ساتھ فراہم اور مرتب نہ کیا تو ہندوستان میں اردو کا مستقبل نہ رہے گا۔ حالی کا یہ مشورہ سو سال گزرنے کے بعد بھی ہمارے لئے مشعل راہ ہے کہ اردو زبان کی توسیع کے لئے عربی و فارسی میں کم سے کم متوسط درجے کی لیاقت کو ہو اس کے علاوہ ہندی اور دوسری ہمالی ہند کی زبانوں سے بھی واقفیت ضروری ہے۔

حالی کی تنقید اردو غزل پر۔

مقدمہ شعر و شاعری میں حالی نے مشرقی و مغربی شعری نظریات اور زمانہ حال کے

تقاضون کے پیش نظر نیچرل شاعری کا وہ نظریہ پیش کیا وہ ادب میں افادی اور اخلاقی قدروں اور فطرت انسانی کی صحیح ترجمانی پر مبنی ہے۔ یہ نظریہ بہت حد تک عصر معاشرتی زندگی میں افراد کے ذہن میں جذباتی اور روحانی پہلوؤں پر محیط ہے۔ حالی جمالیاتی قدروں کے قائل ہیں لیکن فحاشی اور عریاں نگاری سے متنفر ہیں۔ وہ قدما کے کمالات کے معترف ہیں لیکن ان کی آڑ میں رسم پرستی، روایت پسندی اور فرسودہ شعری نظام کو نہیں پسند کرتے۔ اردو شاعری کے اہم اصناف غزل قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی پر مفصل بحث کے دوران انہوں نے اس امر کی تلقین کی ہے کہ کسی بھی زندہ زبان کے لئے ایسے ادب کی تخلیق ضروری ہے جو سیرت و بصیرت کا سامان ہی یکا نہ ہو بلکہ نئے زمانہ اور روح عصر کی عکاسی بھی ہو سکے۔

غزل حالی کا محبوب صنف ہے۔ یہ امر قابل غور ہے کہ "مقدمہ" لکھنے سے پہلے حالی اچھے غزل گو شاعر تھے۔ وہ اس صنف کے تمام فنی و جمالیاتی نکات سے واقفیت کے ساتھ متقدمین سے لے کر متاخرین تک تمام شاعروں کے کمالات سے کماحقہ واقف تھے۔ ان کو اس امر کا احساس دقت سے تھا کہ غزل جیسی مقبول عام صنف شاعری کہیں اردو زبان کی رسوائی کا باعث نہ ہو جائے کیونکہ پڑھے برسوں میں اساتذہ و مداحین نے اس صنف میں کمالات حاصل کئے وہ اپنی کہ اس قدر اضافہ ہیں لیکن اس سے بھی انکار نہیں کہ جہاں مغربی زبانوں میں نئی شاعری کے نئے پہلو نکل رہے تھے وہاں اردو کے غزل گو شعرا بے وقت کی راگنی الاپ رہے تھے۔ حالی جیسے وقت شاعر، نقاد اور مصلح کے دل میں قومی ہمدردی کا جذبہ قوی تھا۔ وہ اردو زبان اور بالخصوص شاعری کو اعلیٰ مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے لہذا "مقدمہ" میں ان کا لہجہ اور انداز بیان افادی رنگ لئے ہوئے ہے۔

"مقدمہ" میں جہاں حالی نے غزل سے تفصیلی بحث کی ہے وہاں انہوں نے غزل کے فن اور اس کے ارتقا سے ہمیں مختصراً متعارف کرایا ہے۔ اور اس کے لئے جواز فراہم کیا ہے۔

ان کا خیال ہے کہ اگرچہ غزل کی اصل وضع مخرعشقیہ صنا مین سے ہوئی تھی لیکن اپنی مدت کے بعد وہ اپنی اصلیت پر قائم نہین رہی ۔ ایران اور ہندوستان مین اکثر شاعرون نے غزل مین عشقیہ صنا مین کے ساتھ تصوف اور اخلاق کو بھی شامل کرلیا ۔ غزل مین مسلسل مضمون عموماً نہین بیان کیا جاتا بلکہ جدا جدا خیالات الگ الگ بحرون مین ادا کئے جاتے ہین اس لحاظ سے غزل مین موقع بہ موقع فوری جذبات اور تازہ کیفیات کو فوراً فوراً بیان کرنے کی ضرورت ہے ۔

حالی کو اس امر کا شدت سے احساس ہے کہ غزل کی شاعری اب رو بہ زوال ہے اور وہ محض ایک " بیسود اور دور از کار صنف " معلوم ہوتی ہے لیکن اس صنف کی مقبولیت کے پیش نظر اس کی اصلاح بھی ضروری ہے ۔ غزل کی مقبولیت کے سلسلے مین حالی لکھتے ہین ــــ

" قوم کے لکھے پڑھے اور ان پڑھ سب غزل سے مانوس ہین ۔ بچے جوان اور بوڑھے سب تھوڑا بہت اس کا چٹخارا رکھتے ہین ۔ وہ بیاہ شادی کی محفلون مین ، وجد و سماع کی مجلسون مین ، لہو و لعب کی صحبتون مین تکیون مین اور رمنون مین برابر گائی جاتی ہین ۔ اس کے اشعار ہر موقع اور محل پر بطور سند یا تائید کلام کے پڑھے جاتے ہین ۔"

اس ظاہر ہے کہ صنف سخن عوام و خواص مین یکساں طور پر مقبول ہے اس کا اثر قومی و معاشرتی زندگی مین دور رس ہوسکتا ہے لہذا غزل کو زندہ رکھنے کے لئے اس کی اصلاح بھی ازحد ضروری ہے ۔

" غزل کی اصلاح جس قدر ضروری ہے اس قدر دشوار بھی ہے ۔ غزل مین جو عام دلفریبی ہے اصلاح کے بعد اس کا قائم رہنا نہایت مشکل ہے جو کان بچپن سے مانوس ہوجاتے ہین وہ دھرت اور خیال سے لذت نہین اٹھا سکتے ۔ داستان سننے والون کی پیاس تاریخی واقعات سے ہرگز نہین بجھ سکتی ۔ بوالہوسی اور کامرانی کی باتون مین جو مزا ہے وہ خالص عشق و محبت مین ہر شعر کو حاصل نہین ہوسکتا ..... جن مذاقون پر ہزل و مطائبہ کا رنگ

---

۱ ۔ خواجہ الطاف حسین حالی ، مقدمہ شعر و شاعری ، مرتبہ وحید قریشی ، ص ۱۲۹

چڑھ جاتا ہے۔ ان پر حکمت اور اخلاق کا منتر کارگر نہیں ہوتا ۔ جو لوگ سرمہ کاجل ، کنگھی چوٹی پر فریفتہ ہیں وہ حسن ذاتی کی حقیقت تک کیونکر پہنچ سکتے ہیں لیکن زمانہ بہ آواز بلند کہہ رہا ہے کہ یا عمارت کی ترمیم ہوگی یا عمارت خود نہ رہے گی "۔[1]

حالی اپنے تجربے ، معاہدے ، صنف غزل اور اپنے معاصرین کے جذباتی لگاؤ سے بخوبی واقف ہیں ۔ وہ غزل کے قدر و قیمت کے معترف ہیں البتہ انہیں اس بات کا رنج ہے کہ یہ صنف اپنا اصلی رنگ کھو چکا ہے اور اس پر تصنع اور بوالہوسی کی چھاپ نمایاں ہے ۔ غزل کو جن لوگوں نے ایران اور ہندوستان میں مقبولیت بخشی وہ خدا والے اور عشق الٰہی سے سرشار سمجھے جاتے تھے ۔ سعدی ، رومی ، خسرو ، حافظ اور جامی وغیرہ شعرا کے غزل کا موضوع عشق مجازی نہ تھا بلکہ حقیقت کو مجاز کے پردے میں ظاہر کرتے تھے ۔ یہ شعرا اپنے کلام میں دنیا کی بے ثباتی کا احساس دلاکر اور ریاکاری و خود پرستی سے نفرت کی تلقین کرتے تھے ۔ یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ متقدمین کے کلام میں سادگی ، خلوص اور فطری رنگ غالب تھا لیکن متوسطین اور متاخرین کے یہاں چند مستثنیات کے علاوہ " الفاظ میں صنعت اور خیال میں رکاکت اور ثقالت " کا اضافہ ہوتا گیا ۔

حالی غزل پر بیجا تنقید یا غزل گویوں کی خورد ، گیری کے بجائے اس صنف سخن کی اصلاح کے لئے چند مشورے پیش کرتے ہیں ۔ وہ ہمارے لئے کئی اعتبار سے اہم ہیں ۔ اول یہ کہ جزئی تنقید اور اصلاح کے متعلق جو لکھا ہے اس میں خلوص و دردمندی ہے ۔ دوم وہ اردو غزل میں انگریزی نظم کی خوبیاں دیکھنا چاہتے تھے اور اس لئے وہ اردو کا دامن ایسے پھولوں سے بھرنا چاہتے تھے جو نئی مٹی اور نئے آب و ہوا کی پیداوار ہوں اور جن میں

---

۱ ۔ خواجہ الطاف حسین حالی ، مقدمہ شعر و شاعری ، مرتبہ وحید قریشی ، ص ۱۹ ، ط ۱

باسی ہونٹوں کی بو یا کملاہٹ کا احساس نہ ہو۔

(۱) غزل کے لئے یہ ضروری سی بات قرار پاتی ہے کہ اس کی بنا عشقیہ مضامین پر رکھی جائے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ جب تک غزل میں عشق و محبت کا عنصر شامل نہ ہو اس کی مقبولیت مشکوک ہوجاتی ہے مگر جب بد مذاقی بڑھ جاتی ہے تو عشق و عاشقی کی جگہ تعیش اور لہو و لعب میں ہی لوگوں کو لطف آنے لگتا ہے۔ حالی اس بات پر افسوس کرتے ہیں کہ " بارہا نوجوان " اور " ستر برس کے بزرگ " دونوں اپنے سن و سال کے تقاضوں سے بے نیاز ہوکر روایتی انداز میں شاہد بازی اور ہوا پرستی کے مضامین باندھنے پر فخر کرتے ہیں۔ حالی یہ بات زور دیکر کہتے ہیں کہ انسانی تعلقات اور معاشرے میں مختلف افراد سے رابطہ کے بعد نظر محبت کے کئی پہلو نمودار ہوتے ہیں لہذا وہ عشقیہ مضامین میں وسعت، تنوع اور جدت کی تلقین کرتے ہیں۔

" ہماری یہ رائے ہے کہ غزل میں جو عشقیہ مضامین باندھے جائیں وہ ایسے جامع الفاظ میں ادا کئے جائیں جو دوستی اور محبت کے تمام انواع و اقسام اور تمام جسمانی اور روحانی تعلقات پر حاوی ہوں "۔[۱]

حالی غزل کی نزاکت و لطافت کے پیش نظر اس بات پر اصرار نہیں کرتے کہ عشقیہ مضامین غزل سے بالکل خارج کر دیئے جائیں البتہ وہ اظہار کی شائستگی اور رمزیت پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ بے حیائی اور فحاشی ان کے نزدیک کسی طور پر اعلیٰ شاعری کی ضمانت نہیں۔ اردو غزل میں امرد پرستی کے مضمون پر ان کا ردعمل بالکل واضح ہے مشرقی بالخصوص سنسکرت و ہندی شاعری میں محبوب عورت ہوتی ہے۔ عاشق ہوکر بھی وہ عورت ہی رہتی ہے لیکن ایرانی اثرات نے اردو غزل پر ایسی چھاپ ڈالی کہ مرد کا مطلوب مرد ہوگیا۔ حالی کے بقول یہ ایک قبیح اور ناشائستہ دستور ہے۔ اور اس کو جہاں تک ممکن ہو ترک کردینا چاہئے اس لئے ان کا مشورہ

۱۔ خواجہ الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری، مرتبہ وحید قریشی، ص ۱۸۲

کہ غزل میں کوئی ایسا لفظ نہ آئے جائے سے صریح طور پر مطلوب کا مرد یا عورت ہونا پایا جائے۔ حالی کا یہ خیال بہت حد تک درست ہے کہ ہر زمانے کا مذاق اور معاشرتی اخلاقی معیار الگ ہوتے ہیں۔ اکبر دارانہ نظام میں عیاش حکمرانوں کی دلجوئی کے لئے جو فحش عناصر غزل میں در آئے ان کا موجودہ زمانے میں کوئی جواز نہیں۔

"مقدمہ" میں حالی غزل کے بنیادی تصورات و معمولات سے اتنے بیزار نہیں جتنا کم مایہ شاعروں کے طائفوں اس صنف سخن کی درگت سے۔ وہ کلاسیکی اعتدال کے قائل تھے لہذا جب انہوں نے غزل میں عشق و تعشق، ہوس و کئی، ملیت، امرد پرستی اور شاہد بازی کا میلان غالب دیکھا تو اس رجحان کے خلاف آواز اٹھانا اپنا اولین فرض سمجھا انہیں اس کا بخوبی اعتراف ہے کہ اس صنف سخن کو میر اور غالب جیسے عظیم شاعروں نے اپنایا کیونکہ اس میں ترقی کے بے حد امکانات ہیں لیکن خوبیاں دوسری طرف جب ان کی نظر دوم درجے کے شاعروں اور درباری بھانڈوں یا بازاری تہ بندوں پر پڑی تو وہ اندیشہ ہائے دور دراز سے تلملا اٹھے کہ مبادا کہیں غزل پر یہی عناصر نہ حاوی ہو جائیں۔

(۲) غزل کے مقبول عام مضامین میں عشقیہ مضامین کی افراط ہوتی ہے لیکن خمریات کا حصہ بھی کچھ کم نہیں ہوتا۔ "خمریات یعنی شراب اور اس کے لوازمات کا ذکر اور نیز فقہا و زہاد اور تمام اہل زاہد پر طعن اور تعریض کرنی۔ ابتدا میخواری و توبہ شکنی و خرابات نشینی پر فخر کرنا اور اہل شرع اور اہل تقوی کے اعمال و اقوال میں عیب نکالنے اور اس قسم کی باتیں جو عقل اور شرع کے خلاف ہوں۔ یہ مضامین بھی غزل کے لوازمے غیر منفک قرار پا چکے ہیں۔[۱]

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ غزل میں خمریات کا استعمال شعرائے متصوفین مثلاً سعدی، رومی، حافظ اور خسرو وغیرہ نے کیا۔ ان مشاہیر کی مشہور عام غزلوں

۱۔ نوا، الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری، مرتبہ وحید قریشی، ص ۱۸۱

کی مقبولیت دیکھ کر اردو غزل گویوں نے بھی ان کی تقلید کی ۔ متقدمین شعرا تو صوفی شاعروں کی طرح شراب و ساقی ، جام و پیمانہ اور دوسرے لوازمات کو مجازاً استعمال کرتے رہے ۔ لیکن متاخرین نے انھیں واقعی معنوں میں استعمال کرنا شروع کر دیا اس سے غزل کی لطافت و معنویت جاتی رہی اور اس کی جگہ رکاکت اور پھکڑپن کو راہ ملی ۔ کچھ غزل گو شعرا ایسے بھی نکلے جنھوں نے کبھی شراب کو منھ نہیں لگائی اور نہ زندگی میں کبھی میخانے تک پہنچے ۔ لیکن اپنے کلام میں ان مضامین کو باندھنے اور زہاد پر حملے کرنے میں وہ بھی پیش پیش رہے ۔ حالی کے نزدیک یہ روایت پرستی جو جھوٹی مبالغہ اور طنز و تعریض پر مبنی ہے غزل کے لئے موجودہ زمانے میں معیوب ہیں ۔

(۲) حالی غزل کے دامن کو مختلف النوع مضامین سے مالامال کرنا چاہتے تھے ان کا خیال تھا کہ عشقیہ اور خمریاتی مضامین کے علاوہ انسانی زندگی اور فطرت سے ایسے موضوعات شاعری کے لئے منتخب کئے جا سکتے ہیں جن سے اردو کا دامن بھر سکے ۔

" مذکورہ بالا مضامین کے سوا اور جس بات کا سچا جوش اور ولولہ دل میں اٹھے خواہ اس کا منشا خوشی ہو یا غم یا حسرت یا ندامت یا شکر یا شکایت یا صبر یا رضا یا قناعت یا توکل یا رغبت یا نفرت یا رحم یا انصاف یا غصہ یا تعجب یا امید یا ناامیدی یا شوق یا انتقام یا حب وطن یا قومی ہمدردی یا حب رسول اللہ یا حمایت دین و مذہب یا دنیا کی بے ثباتی اور موت کا خیال یا اور کوئی جذبہ جذبات انسانی میں سے اس کو بھی غزل میں بیان کر سکتے ہیں ۔[1]

اس میں کلام نہیں کہ حالی نے نہایت خلوص کے ساتھ یہ اپیل کی ہے کہ شاعروں کو نئے موضوعات اور تازہ مضامین غزل میں برتنے چاہئیں لیکن جن مضامین کی طرف انھوں نے اشارے کئے ہیں مثلاً حب وطن ، قومی ہمدردی یا حمایت دین کے مضامین وہ شاید غزل جیسی نازک صنف سخن کے لئے

---

۱ ۔ خواجہ الطاف حسین حالی ، مقدمہ شعر و شاعری ، مرتبہ وحید قریشی ، ص ۱۸۸

موزون نہیں ثابت ہوسکتے ۔ حالی کے بعد حسرت ، فانی ، اصغر ، اقبال ، چکبست ، جگر ، فراق اور فیض وغیرہ شعرا نے تغزل کو وسعت دی اور اسے نئی سمتوں سے آگاہ کیا لیکن انھوں نے حالی کے منشور پر عمل نہیں کیا ۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اگرچہ تمام اصناف ادب کا موضوع انسانی زندگی ہے لیکن ہر صنف سخن کے اپنے لوازمات ہیں ۔ رزمیہ ، المیہ ، غنائیہ ، مرثیہ اور نظم وغیرہ کے لئے حدود متعین ہیں لہذا غزل کی اصلاح کے سلسلے میں حالی کے منشور تمام غزل کو شعرا کے لئے قابل قبول نہیں ہوسکتے تھے ۔ حالی کے " مقدمہ " کی تاریخی اور نظریاتی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا ۔ غزل جو اردو شاعری کی جان ہے اسے نشر ، جذبات کا آرگن ہونا چاہئے ۔ اس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو ۔ مشہور انگریزی شاعر ورڈس ورتھ نے اپنی نظموں کے مقدمہ (PREFACE TO LYRICAL BALLADS) میں شاعری کے لئے جن موضوعات یا ہر قسم کی وکالت کی اسے نہ تو وہ خود پوری طرح برت سکا اور نہ اس کے بعد آنے والے شاعروں نے ان پر کوئی خاص توجہ دی لیکن نیچرل شاعری کی جس پرزور انداز میں اس نے حمایت کی اس سے ہم بے نیاز نہیں رہ سکتے ۔ ورڈس ورتھ کی طرح حالی بھی ہمعصر شاعری کو " مرصع اور بے ان " کہہ کر نئے انداز فکر اور نئے طرز اسلوب کی دعوت دیتے ہیں ۔

> " ہر بات کا ایک محل اور ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے ۔ عشق و عاشقی کی ترنگیں لقا اقبال مندی کے زمانے میں زیبا تھیں ۔ اب وہ وقت گیا ۔ عہد و عشرت کی رات گزر گئی اور صبح نمودار ہوئی ۔ اب کانگڑے اور بہاگ کا وقت نہیں رہا ۔ اب جو گیرکے الاپ کا وقت ہے " ۔[1]

غزل پر بحث کرتے ہوئے حالی مغربی ادب بالخصوص انگریزی ادب کے بیش بہا سرمایہ اور نظم و نثر میں ہر قسم کے بلند ، لطیف و اکیزہ خیالات کے ذخیرے کی نشاندہی کرتے ہیں اور ان تمام عالی دماغ شاعروں سے نئے خیالات اخذ کرکے اردو شاعروں کو مالامال کرنے کی

---

۱ ۔ خواجہ الطاف حسین حالی ، مقدمہ شعر و شاعری ، ص ۱۹

تلقین رتیے ہین ۔ اس لیے وہ عربی و فارسی اور ہندی ہی نہین بلکہ مغربی شاعری سے بھی خیالات حاصل کرکے اردو شاعری کے اندر " ترقی کی روح " پھونکنا چاہتے ہین ۔

(٤) غزل کے سلسلے مین حالی نے زبان کا مسئلہ بھی اٹھایا ہے ان کا خیال ہے کہ ہر صنف غزل کے مضامین محدود ہین اسی طرح اس کی زبان بھی ایک خاص دائرے سے باہر نہین نکل سکتی ۔ بمقابلہ دوسرے اصناف کے غزل کے لئے صاف اور سادہ زبان ضروری ہے ۔ غریب اور اجنبی یا ثقیل و غیر مانوس الفاظ کی کھپت یا ممکن نہین ۔ حالی کو اردو غزل کی نزاکت کے پیش نظر یہ احساس ہوتا ہے کہ

" گلاب کے تختے مین کانٹے بھی پھولون کے ساتھ نپجتے ہین مگر گلدستہ مین ایک کانٹا بھی کھٹکتا ہے "۔[1]

اردو مین ولی سے لے کر انشا و مصحفی تک عموماً " سب کی غزل مین صفائی و سادگی اور روزمرہ کی ابتدائی بیان مین کھلاوٹ اور زبان مین لچک پائی جاتی ہے ۔ غالب و مومن و شیفتہ وغیرہ کے یہان فارسی ترکیبون کے باوجود اردو محاورہ اور زبان کی لذت سلاست کا خیال رکھا جاتا ہے ۔ حالی کا خیال ہے کہ لکھنؤ اسکول کے شاعرون نے اصلاح زبان کے زعم مین غزل کو بہت نقصان پہنچایا ۔

" ہندی الفاظ رفتہ رفتہ ترک اور ان کی جگہ عربی الفاظ کثرت سے داخل ہونے لگے "۔[2]

حالی نے غزل مین زبان و بیان کی صفائی کی غرض سے چند باتون پر خاص توجہ دی ہے ۔

(الف) غزل کے موضوعات مین وسعت دینے کے ساتھ طریقۂ بیان مین بھی وسعت کی ضرورت ہے ۔ یہ خیال رہے کہ تمام جدت کے باوجود اسے عام پسند رہنا چاہئے ۔ حالی خود بھی غزل کے اچھے شاعر اور پارکھ تھے لہذا وہ اس امر کی تلقین کرتے ہین کہ نامعلوم و غیر مانوس الفاظ کے بجائے قدما کے اسالیب کی پیروی کی جائے ۔ الفاظ کے حقیقی معنون ہی پر قناعت

۱۔ خواجہ الطاف حسین حالی ، مقدمہ شعر و شاعری ، مرتبہ وحید قریشی ، ص ۲۰۲
۲۔ ایضاً ، ص ۲۰٤

نہ کریں بلکہ ان کو کبھی حقیقی معنوں میں کبھی مجازی معنوں میں ، کبھی استعارہ اور کنایہ کے طور پر اور کبھی تمثیل کے پیرایہ میں استعمال کریں ۔[1]

اس کا مطلب یہی ہے کہ شاعر کو مجاز و استعارہ ، کنایہ و رمز کے استعمال پر قدرت ہونا چاہئے تاکہ وہ روکھے پھیکے مضامین کو بھی آب و تاب کے ساتھ بیان کرسکے ۔

(ب) محاورہ اصطلاح میں خاص اہل زبان کے روز مرہ یا بول چال یا اسلوب بیان کا نام ہے ۔ شاعری بالخصوص غزل میں محاورہ کے [illegible] موزوں استعمال سے پست شعر بھی بلند ہو جاتا ہے ۔ حالی نے یہ بات بالکل صحیح کہی ہے کہ زبان و محاورا کے استعمال میں بھی عوام و خواص [illegible] بہت بڑا فرق ہے ۔ عوام محاورہ یا روزمرہ کے ہر شعر کو سن کر سر دھنتے لیکن اگرچہ شعر کا مضمون کیسا ہی رکیک اور مبتذل کیوں نہ ہو ۔ اس کے برخلاف خواص مضمون کی سنجیدگی اور محاورہ کے برمحل استعمال کو اہمیت دیتے ہیں ۔ محاورہ شعر کا زیور ہے لہذا اسے اس طرح باندھنا چاہئے کہ طبع سلیم پر بار نہ ہو ۔

( ) حالی کا دعوی ہے کہ صنایع بدایع پر کلام کی بنیاد رکھنے سے اکثر معانی کا سر رشتہ ہاتھ آتا رہتا ہے اور کلام میں بالکل اثر باقی نہیں رہتا چنانچہ ان کا مشورہ ہے کہ صنایع کی ابتدائی سے غزل کو محفوظ رکھنا چاہئے ۔ حالی نے اشعار کے ذریعے ثابت کیا ہے کہ مراثی لکھنؤ نے مراثی دہلی کے مقابلے میں صنایع بدیع پر زیادہ توجہ صرف کی ہے ۔ مگر حالی کو اس پر اصرار ہے کہ

" شعر کی اصل خوبی یہ ہے کہ نیچرل ہو ، موثر ہو ، لفظاً " اور معناً " سانچے میں ڈھلا ہو "۔[2]

رعایت لفظی اگر فطری طور پر شعر میں داخل ہو جائے تو بہتر ورنہ اس کی کوئی ضرورت نہیں "۔

(د) سنگلاخ زمینوں میں لکھنؤ کے اور دلی کے مراثی متاخرین نے ہزارہا غزلیں

۱۔ مقدمہ انصاف حسین حالی ، مقدمہ شعر و شاعری ، مرتبہ وحید قریشی ، ص ۳۶
۲۔ ایضاً ، ص ۲۲۳

لکھی ہیں ۔ میر ، سودا ، ذوق اور درد و اثر کے یہاں ایسی زمینوں میں بہت کم غزلیں ملتی جاتی ہیں ۔ اس کی ابتدا مصحفی اور انشا کے زمانے سے ہوئی ۔ شاہ نصیر اور ظفر کے یہاں ان کی بہتات ہے ۔ البتہ غالب ، مومن اور داغ وغیرہ نے ایسی زمینیں کم اختیار کی ہیں ۔ حالی نے اپنے ذاتی تجربے سے یہ بات کہی ہے کہ غزل میں ردیف اور قافیے کی گھاٹی خود دشوار گزار ہے اور جو لوگ سنگلاخ زمینوں کا انتخاب کرتے ہیں وہ اسے اور بھی کٹھن بنا دیتے ہیں ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معانی پر سست پڑ جاتا ہے اور قافیہ پیمائی ہی شاعر کا ظاہر اکتساب ہوتا ہے ۔

" سنگلاخ زمینوں میں اس کے سوا اور کچھ مقصود نہیں ہوتا کہ دو بے میل چیزوں میں میل ثابت کیا جائے ۔ پس شاعر کو چاہئے کہ ہمیشہ ردیف ایسی اختیار کرے جو قافیہ سے میل کھاتی ہوئی ہو اور ردیف و قافیہ دونوں مل کر دو مختصر کلموں سے زیادہ نہ ہوں بلکہ رفتہ رفتہ غزلیں لکھنی کم کرنی چاہئیں اور سردست محض قافیہ پر اقتناعت کرنی چاہئے ۔ قافیہ ایسا اختیار کرنا چاہئے جس کے لئے قدر ضرورت سے دس گنے بلکہ بیس گنے زیادہ الفاظ موجود ہوں ورنہ مضمون کو قوافی کا تابع کرنا پڑے گا ۔ قافیے مضمون کے تابع نہ ہونگے تو نے نامور شعرا ضرور ہیں انہوں نے یہی اصول ملحوظ رکھا ہے اور ہمیشہ ایسی زمینیں اختیار کی ہیں جن میں ہر قسم کے کیے مضمون کی گنجائش ہو "[1]

حالی مدرسۂ سرسید کے سب سے روشن خیال اور ذہین رکن تھے ۔ انہوں نے سرسید کی علی گڑھ تحریک سے نہ صرف حمایت بلکہ اس تحریک کی روح کو اردو کے اندر جذب کرنے کی

---

۱ ۔ حوالہ الطاف حسین حالی ، مقدمہ شعر و شاعری ، مرتبہ وحید قریشی ، ص ۲۲۶

سرسید کوشش کی ۔ وہ بھی مصلح اعظم سرسید کی طرح اردو ادب کو زندگی کے دوش بدوش
لانا چاہتے تھے ۔ اس لئے انھوں نے نیچرل شاعری کے ساتھ سائنٹیفک تنقید کی طرف بھی قدم
بڑھایا ۔ انگریزی یا غیر ملکی ادب کا مطالعہ کچھ اور ہے اور اردو فارسی و عربی کے
ساتھ جدید ادب کی رکھ اور ۔ حالی نے سب سے پہلے اس طرف توجہ کی اور آج تک کوئی
نقاد اصولی یا عملی تنقید میں ان سے آگے نہیں جا سکا ہے ۔ بلاشبہ وہ اردو کے جدید
اور کلاسیکی نقاد ہیں ۔

امداد امام اثر اور کاشف الحقائق

سید امداد امام اثر

جدید اردو تنقید کی ابتدا حالی سے ہوئی جو مدرسۂ سرسید کے پروردہ اور اپنے دور کے اہم نمائندہ تھے لیکن انیسویں صدی کے اواخر میں کچھ ایسے اہل قلم بھی نظر آتے ہیں جو براہ راست کسی تحریک یا دبستان سے متعلق نہ تھے مگر انکے دلوں میں اردو کو یورپ کی جدید ترین زبانوں کا ہم پلہ بنانے کا جذبہ کام کررہا تھا ۔ سید امداد امام اثر مصنف " کاشف الحقائق " کا شمار ایسے ہی منفرد لوگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے مشرقی علوم کے ساتھ مغربی ادب کا بھی مطالعہ کیا تھا اور اردو ادب بالخصوص اردو شاعری کو انگریزی کے مدمقابل لانے کے خواہش تھے ۔

امداد اثر کا زمانہ وہ ہے جب اردو تنقید میں " آب حیات " اور " مقدمہ شعر و شاعری " جیسی عہد آفریں کتابیں لکھی جاچکی تھیں اور ناقد اثر ادبی حلقوں میں محسوس کیا جانے لگا تھا ۔ اثر فارسی و عربی کے متبحر عالم تھے لیکن انھیں مغربی ادبیات کے مطالعے کے مواقع نصیب ہوئے تھے اس لئے وہ اپنے معاصرین آزاد اور حالی کے مقابلے میں انگریزی اور یورپین ادب سے بھی ذاتی طور پر خاصے واقف تھے اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں ۔۔۔

" ..... یہ ہیچمدان ابتدائے سن شعور میں بھی شاعری کی طرف میلان بھی رکھتا تھا ۔ ہرچند اسے شاعری کی قوت نہ تب حاصل تھی اور اب ہے ۔ تو بھی شاعری کی موثاثیری کا اس وقت بھی ویسا ہی معترف تھا جیسا کہ اس وقت ہے ۔ اس میدان طبعی کے تاثیر سے یہ فقیر عہد طالب علمی میں شعرائے یورپ و ایشیا کی تالیف کو استادوں سے برغبت تمام پڑھا کرتا تھا اور بعد منقلی ہونے اس عہد پر بھی حتی الامکان کتب بینی کے ذریعے سے اپنی واقفیت شاعری کو بڑھاتا رہا ۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ کسی قدر شعرائے یورپ و ایشیا کے طرز کلام اور انداز مذاق سے آشنا ہوگیا ۔"[1]

DS.1641

۱۔ مقدمہ سید امداد امام اثر ، کاشف الحقائق ، مرتبہ ڈاکٹر وہاب اشرفی ، ص ۴۶

اس سے صاف ظاہر ہے کہ انھوں نے قدیم شعرائے ہند اور دوسری ایرانی زبانوں کی شاعری میں بھی استعداد حاصل کی تھی ۔ اس وسیع مطالعے اور شعری مذاق کا لازمی تقاضا یہ تھا کہ وہ اپنے تاثرات اور تاملات کو موثر شعری اظہار میں لے آئیں ۔ عرض تصنیف ہذا میں لکھتے ہیں

" اس رسالے کے مطالعہ سے حضرات ناظرین پر روشن ہوگا کہ شاعری کیا شے ہے ۔ اس کی کیا قسمیں ہیں ۔ ہر قسم کا کیا تقاضا ہے ۔ فطری غیر فطری شاعری میں کیا فرق ہے اور دونوں سے کیا نتائج مرتب ہوتے ہیں ۔ قصیدہ ، مثنوی ، غزل ، رباعی ، مراثی وغیرہ کا کیا انداز ہونا چاہئے "[1]

امداد امام اثر شعری کا جائزہ لینے سے پہلے اثنات کو مادی اور غیر مادی میں تقسیم کرتے ہیں ۔ اور اس نسبت سے یہ بھی طے کرتے ہیں کہ کس شاعر نے اپنے کلام میں کس قسم کے مضامین داخل کئے ہیں یعنی وہ خارجی شاعر ہے یا داخلی ۔ ان کا یہ قول صحیح ہے کہ بعض شعرا معاملات خارجیہ کے بیان کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں اور بعض کی طبیعت اس کے برعکس ہوتی ہے ۔ ایسے شاعر معدود چند ہیں جو معاملات خارجیہ اور امور ذہنیہ دونوں کے بیان پر یکساں قدرت رکھتے ہیں ۔ شاعری ان کے نزدیک " رضائے الٰہی کی ایسی نقل صحیح ہے جو الفاظ بامعنی کے ذریعے سے ظہور میں آتی ہے " شاعری سے مطلب ہے دو اور فنون ہیں یعنی موسیقی و " رضائے الٰہی کی نقل صحیح بذریعہ نغمہ اور قلم کا ربون کے ہے " اس طرح شاعری ، موسیقی اور مصوری تینوں ان کے نزدیک شریف اور نفیس فن رضائے الٰہی کی نقل صحیح ہیں اور دارومدار ان تینوں فنون کا ہے ۔ تبعیت فطراللہ پر ہے ۔

" ہر بشر خواہ فطرت کی خوبیوں اور باریکیوں کو درک نہیں کرسکتا اور مشاہدات عالم درونی و بیرونی کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے اور بعض بعد مشاہدات صحیحہ کے رضائے الٰہی کی نقل صحیح الفاظ ، معنی یا اصوات موزون

---

۱ ۔ صحیفہ سید امداد امام اثر ، کاشف الحقائق ، مرتبہ ڈاکٹر وہاب اشرفی ، ص ۴۸

یا ذوق قلم اربون کے وسائل سے نہیں ہو سکتا ہے تو ایسا شعر نہ شاعر ہے
نہ ماہر موسیقی نہ مصور کہہ سکتا ہے"۔[1]

اردو غزل پر امداد امام اثر کی تنقید کا جائزہ لینے سے پہلے ضروری ہے کہ ان کے ماخذ تصورات اور شعری نظریات کا مطالعہ کیا جائے۔ بعض نقاد اثر کے قاموسی مطالعہ سے مرعوب نظر آتے ہیں۔[2] لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کی تنقید نگاری تبصرہ روایات حکایات اور حدایات و نقائص کا مرتب ہوتی ہے اس لئے خالص تنقیدی مواد کی تلاش ان کی تحریروں میں بیکار ہے لیکن "بہارستان سخن" (معروف بہ کاشف الحقائق) کے ہر صفحہ پر کوئی نہ کوئی دلچسپ اور خیال انگیز نکتہ ضرور ملتا ہے۔ شاعری پر بحث کرنے سے پہلے وہ موسیقی اور مصوری کی تشریح و توضیح ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ ان دونوں فنون کا شاعری سے بنیادی رشتہ ہے۔

امداد امام اثر کے نزدیک موسیقی ایک قسم کی شاعری ہے۔ ہر عالم موسیقی کا فرض منصبی ہے کہ شعوہ "اصوات غم و سرور" کے ہر کیفیت کی آواز سے اخلاق رکھے اور ان کو برانگیختہ کرنے پر قادر ہو۔ موسیقی اعلیٰ شاعری کی طرح اخلاقی پہلو رکھتی ہے اور اس سے روح کا تزکیہ اور نفس کی تہذیب ممکن ہے۔ ان کے بقول وہ گویے جو عوام موسیقی کے شیدا ہیں اور جو سیر نغمہ حرام کاری، فسق و فجور، رندی و اوباشی کی طرف مائل ہوجاتا ہے وہ موسیقی نہیں بلکہ عنا ہے۔ اس طرح اثر نے موسیقی اور عنا کے درمیان حد فاصل قائم کردی۔ شاعری پر اخلاقی اور غیر اخلاقی پہلوؤں کو بھی واضح کیا ہے۔ اعلیٰ شاعری میں موسیقی کا عنصر لازم ہے اور اس سے اخلاق کی تہذیب ممکن ہے۔ اثر کے اعلیٰ شاعری کے معیار سے ہمیں میتھو آرنلڈ کی یاد آتی ہے جو ورڈسورتھ پر تبصرہ کرتے ہوئے مضمون میں کہا تھا کہ "شاعری میں اصل بات سے بغاوت در حقیقت زندگی سے بغاوت ہے"۔

مصوری بھی شاعری سے رابطہ رکھنے والے فنون میں سے ہے۔ شاعر کی طرح مصور کے لئے بھی

۱۔ مرتبہ سید امداد امام اثر، کاشف الحقائق، مرتبہ ڈاکٹر وہاب اشرفی، ص ۵۱، ۵۲
۲۔ ایضاً، ص ۱۰

کائنات ا مشاهده ، اور امور داخلیه پر قدرت لازم هے لیکن اثر نے مصور کے لئے جو علمی اهمیت لازمی قرار دی هے وہ حیرت انگیز هے ان کے نزدیک مصور کو " علم حساب ، جبر و مقابله ، اقلیدس ، علم مثلث ، کیمسٹری ، علوم معدنیات ، نباتات و علم حیوانات ، علم هیئت ، علم مرایه و مناظره ، جغرافیه ، تاریخ ، حکایات ، قصص ، تمدن ، معماری ، ادب اور جمیع علوم سے کافی دستگاه رکھنا واجبات سے هے " همارے نزدیک مصنف نے یہاں زیادتی معلومات کی رو میں ایسا ایسا حکم لگا دیا هے جو قابل عمل نہیں ۔ اگر کوئی فنکار ان علوم کو حاصل کرنے کی کوشش کرے تو فنکار بننے کا تو خیر اس کی زندگی میں موقع ہی نہ ملے گا لیکن وہ ساری جد و جہد کے باوجود اپنی زندگی میں ان علوم کی ایک ادنی کسر بھی نہ حاصل کر سکے گا ۔ اثر نے بالآخر میں چند تصویریں دیکھی تھیں جن میں حضرت آدم اور بیبی حوا کو باغ عدن میں دکھایا گیا تھا حوا کی ترغیب گناه اور آدم اور حوا کو مبتلائے غضب الٰہی دیکھ کر وہ اپنے اعلی مصور کے قوت تخیل کی داد دیتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصور نے اپنے فن میں رضائے الٰہی کے بجائے اپنی انفرادیت اور تخیلی صلاحیتوں سے زیادہ کام لیا هے ۔ اثر کا یہ قول کہ مصور کے لئے ضروری هے کہ " معاملات خارجیہ یا امور ذہنیہ کو اس طرح پر دکھاوے کہ ذرہ بھر بھی تقاضائے فطرت کے خلاف نہ ہو " محض فوٹوگرافری کی تعریف هے اس کو اصل مصوری سے بہت کم واسطہ هے ۔ شاعر کی طرح مصور بھی حقیقت اور افسانے کے امتزاج سے فنی انفرادیت حاصل کرتا هے ۔ غالب نے بھی کہا هے ۔

هر چند هو مشاهده حق کی گفتگو

بنتی نہیں هے بادہ و ساغر کہے بغیر

شاعری میں باهم موسیقی اور مصوری دونوں کو دخل هے ۔ چنانچہ بقول اثر شاعری وہی هے جو عالم درونی و بیرونی کی نقل صحیح ہوتی هے اور الفاظ بامعنی کے ذریعے عمل میں آتی هے ۔ شاعری کا میدان عالم شہادت اور عالم باطن پر محیط هے ۔ اس لئے خارجی شاعری کے ساتھ داخلی شاعری بھی وجود میں آئی جو صرف امور خارجیہ کی عکاسی کرتے ہیں انھیں

خارجی شاعر اور جو کوائف باطنیہ کی ترجمانی کرتے ہیں انہیں داخلی شاعر کہتے ہیں۔ ہومر، فردوسی، شکسپیر اور کالی داس جیسے شعرا دونوں پر قدرت رکھتے ہیں۔ اثر نے شاعری کی کوئی جامع تعریف نہیں کی ہے لیکن انہوں نے جو تعریف بھی کی ہے وہ افلاطون کے ذریعہ اعیان اور ارسطو کے ذریعہ نقل کا عجیب مرکب معلوم ہوتی ہے البتہ اس سلسلے میں ایک بات ایک غور ہے اور وہ یہ کہ شاعری کی خارجی و داخلی تقسیم اردو تنقید میں سب سے پہلے "کاشف الحقائق" میں ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ حالی اور شبلی نے کہیں بھی شاعری کی ایسی قطعی اور واضح تقسیم نہیں کی ہے۔ شاعری کے سلسلے میں دوسری قابل لحاظ بات یہ ہے کہ حالی اور شبلی دونوں نے شاعری کا مدار الفاظ پر رکھا ہے لیکن امداد امام اثر نے کھلے لفظوں میں معنی کی حمایت کی ہے۔

"بعض اشخاص معاملات فطرت سے ناواقف رہنے کے باعث مجرد شوکت لفظی کو شاعری سمجھنے لگتے ہیں اور اس غلط خیالی میں ہمیشہ مبتلا رہا کرتے ہیں۔ امر ہے کہ مجرد شوکت لفظی کوئی شے نہیں ہے۔ شاعری زنہار شوکت لفظی نہیں۔ شاعری کا مدار خوش خیالی پر ہے نہ کہ شوکت لفظی پر۔ شاعری کی جان خوش خیالی ہے۔ شوکت لفظی شاعری کا کوئی جزو بدن نہیں ہے البتہ شوکت لفظی خلعت فاخرہ کا حکم رکھتی ہے اور تب ہی خوشنما معلوم ہوتی ہے قطع برید سے درست ہے اور جو مضمون کو پہنائیں جو جامہ زیب بھی ہو"[1]

صاحب کاشف الحقائق اس بات پر زور دیتے ہیں کہ رعایت لفظی، مبالغہ پردازی اور صنائع بدائع تو شاعری سے کوئی خاص لگاؤ نہیں۔ یہ محض ظاہری آرائش و نمائش کا سامان ہیں۔ اثر شاعری کو اخلاق کی عینک سے دیکھتے ہیں اس لئے اعلیٰ شاعری میں کسی قسم کی پست خیالی بدعنوانی، عریانی یا بدمذاقی ان کے نزدیک روا نہیں ہے۔ ان کا قول ہے کہ ہزاروں

۱۔ مرتبہ سید لطیف امداد امام اثر، کاشف الحقائق، مرتبہ ڈاکٹر وہاب اشرفی، ص ۸۲

مضامین فکری ہوتے ہیں یا وہ قابل اعتراض ہوتے ہیں اس لئے ہر فنکار کا یہ فرض اولین ہے
کہ ایسے مضامین سے احتراز کرے۔ اگرچہ انشا پردازی اور اسلوبی کیفیتوں کے اعتبار سے
امداد امام اثر مغرب کے کسی بڑے مفکر یا صاحب قلم کے مرتبے کو نہیں پہنچتے لیکن جب ہم ان
کے ذریعۂ فن و غور کرتے ہیں تو ہم کو رسکن یاد آجاتا ہے۔ دونوں کا ذریعۂ فن اخلاقی
تھا البتہ یہ بات قابل غور ہے کہ اثر نے یونانی حکماء اور عربی و فارسی شاعری کے مطالعہ
سے بھی بہت کچھ اخذ کئے تھے۔

شاعر اثر کے نزدیک ایک امر طبعی ہے ان کا یہ قول کہ " ہر صاحب واردات قلبیہ
کچھ نہ کچھ شاعر ہے۔" بہت حد تک صحیح ہے۔ ورڈس ورتھ نے اپنے مشہور " مقدمہ "
میں کہا ہے کہ ہر انسان میں شاعری کی رگ موجود ہے لیکن چونکہ ہر شخص میں شاعر کی
بصیرت نہیں ہوتی اس لئے ہر کوئی ہر شعر و نثر کا کام نہیں ہے۔ اس سلسلے میں یہ امر بھی
توجہ طلب ہے کہ ہر ابتدائے تہذیب میں شاعری کا دامن بہت وسیع تھا لیکن ہمارے زمانے میں
اس نے لباس بدل لیے ہوئے ہیں۔ قدیم شعرا ، مورخ ، واعظ ، فلسفی ، دومی اور سیاست دان
غرض یہ سب کچھ ہوتے تھے لیکن تقسیم کار کی وجہ سے اب یہ مناصب الگ الگ ہوگئے ہیں
لیکن شاعری کا عنصر سب میں یہاں کم و بیش موجود رہتا ہے۔ خطیبوں اور واعظوں کی تقریروں
میں اور حکیموں و مورخوں کی تحریروں میں شاعرانہ عناصر سے جان پڑ جاتی ہے۔ ہر زمانے میں
شاعری انسان کے تمدن ، اخلاقی و مذہبی معاملات میں کارآمد رہی ہے یونانیوں ، رومیوں اور
عربوں کے یہاں اس کی بڑی قدر تھی۔ آج بھی دوسرا اخلاق کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں
شاعری بلا یہ خراط کا کام کرتی ہے اور گندہ نا تراش کو بھی سنوار دیتی ہے۔ اثر کے
نزدیک مناظر پرست اقوام مثلاً ہندوؤں ، یونانیوں اور رومیوں کے سارے مذہبی صحیفے اور
وید پران شعر میں تھے مگر محیط موحد اقوام کے مذہبی صحیفے بھی بہت حد تک شعری
خصوصیات کے حامل ہیں۔ انجیل اور قرآن کی مثال سب کے سامنے ہے۔

"کاشف الحقائق" پر تنقید و تبصرہ جدید اصول تنقید کی رو سے میں کچھ زیادہ مناسب نہیں اس لئے کہ صاحب تصنیف کا مغربی علوم کا مطالعہ سطحی اور واجبی تھا۔ اردو تنقید ان زمانوں میں تذکرہ نگاری سے باہر قدم نہیں رکھ سکی تھی اور نہ اس کے سائنٹفک اصول مرتب ہو سکے تھے۔ حالی کا "مقدمہ" قدیم مدرسۂ فکر کے مقابلے میں ایک انقلابی قوت تھی اور ترقی کی راہ دکھا رہی تھی لیکن ان کی اس تصنیف کو فوراً مقبولیت حاصل نہ ہوسکی، یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اثر کی تعلیم و تربیت اور ان کا مذاق سخن خالص مشرقی تھا ان کا تنقیدی ساز و سامان بھی بجز چند اصطلاحات کے تھے، مولویانہ تھا۔ پھر بھی اس دور میں لکھی ہوئی کتاب کے مصنف کی داد نہ دینا بڑی بے انصافی ہوگی۔

مغربیات سے بحث کرتے ہوئے وہ کہیں کہیں بھی ارسطو یا دوسرے مغربی مفکرین کو معرض بحث میں نہیں لاتے بلکہ تمام و کمال اپنے ذوق و وجدان سے کام لے کر اصولی عمل پر اظہار رائے کرتے ہیں جہاں ہمیں قدامت کی جھلک ضرور نظر آتی ہے لیکن مستقبل کی نشاندہی ہوتی ہے۔ "کاشف الحقائق" حصہ اول میں شاعری کے اصول و اسالیب سے بحث کرنے کے بعد اثر مختلف ممالک کی شاعری پر تنقید کا مرحلہ رکھتے ہیں لیکن یہاں تنقید و تبصرہ کم بلکہ ان ممالک کی جغرافیائی، معدنیات، حیوانات، تاریخ (قدیم و جدید)، اخلاق، مذہب اور معاشرت کی تفصیل زیادہ ہے۔ چنانچہ جلد اول میں جنھوں نے انگریزی، فارسی، مصری، یونانی، لاطینی اور عربی شاعری کی خصوصیات سے بحث کی ہے اور ان اصناف کی تاریخ اور اہمیت کو اجاگر کیا ہے وہاں مرور تھے۔

امداد امام اثر اگرچہ مصری، یونانی، اطالوی اور عربی شاعری پر ظاہر خواہ تنقید نہیں کر سکے لیکن کاشف الحقائق حصہ دوم میں جہاں وہ فارسی اور اردو شاعری پر محاکمہ کرتے ہیں تو زیادہ اسباب در آتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ وہ ان زبانوں سے فطری انس رکھتے تھے اور ان کی شاعری پر غور و خوض کر کے کسی نتیجے پر پہنچ سکتے تھے۔ دوسری یہ کہ ان دونوں زبانوں کی شاعری پر کتابیں سہولت کے ساتھ مل جاتی تھیں۔

ہن سے انھون نے استفادہ کیا ۔ بہرحال یہ حصہ کسیکی تنقید مین نہایت اہم ہے ۔

" کاشف الحقائق " حصہ دوم کے ابتدا ہی مین امداد امام اثر نے اردو اور فارسی شاعری کی واحد المذاقی سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ تمام اصناف سخن اردو مین فارسی سے لے گئے اور فارسی شاعری کی تقلید ہی کو کمال سمجھا گیا لیکن اس سے ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ اردو شاعری ملکی عناصر سے بیگانہ ہوگئی اور اس مین سنسکرت شاعری اور ڈرامہ نہین داخل ہوسکے ۔ بلاشبہ فارسی کے ساتھ سنسکرت کی شاعری اردو کے لئے بیحد مفید ثابت ہوتی اور اس سے رزمیہ اور ڈرامائی شاعری کو بھی ترقی ہوتی ۔ اس لئے مین وہ ایران اور ہندوستان کے جغرافیہ اور تاریخ سے بھی بحث کرنا ضروری سمجھتے ہین اور فارسی و اردو شاعری کی مختصر مگر ایک حد تک جامع تاریخ پیش کرتے ہین ۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اثر نے فارسی اور اردو کے تمام اصناف شاعری غزل ، قصیدہ ، قطعہ ، قطعہ ، رباعی ، مخمس ، مسدس اور مثنوی وغیرہ پر تاریخی نقطہ نظر مین بحث کی ہے ۔

غزل پر اثر کی تنقید ۔

اثر نے " کاشف الحقائق " کے ابتدائی ابواب مین ہی دہلی کی شاعری کی نشاندہی کی ہے ۔ شاعری اعلیٰ جس مین رزمیہ انداز ہوتا ہے اور داخلی شاعری جسے وہ بزمیہ شاعری یا غزل سرائی کہتے ہین ۔ یونانی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے اثر اس شاعری صنف کی طرف اشارہ کرتے ہین جسے لیرکس (LYRICS) کہتے ہین اور جو بہت حد تک غزل سے مشابہ ہے ۔

" لیرکس کا تقاضا یہ ہے کہ اس مین ایسے مضامین داخل رہین جو داخلی انداز رکھتے ہین اور شاعری رنگ رکھتے بھی ہون تو سلسلہ داخلی انداز سے آمیز پایا جاتا ہون ۔ اگر لیرکس مین شاعر اس آمیزش کے ساتھ شاعری مضامین کو حوالہ قلم نہ کرے گا تو اس کا کلام بے مزہ ہوگا ۔ یہی سبب ہے کہ بعض فارسی اور اردو شعرا کی غزل سرائی مطبوع نہین معلوم ہوتی ہے ۔ ایسے غزل سراؤن

نیز برخلاف تقاضائے غزل سرائی مضامین خارجی کو بلا آمیزش رنگ داخلی اپنے کلام میں جگہ دی ہے۔ جس کے سبب سے ان کی اکثر غزلیں روکھی سوکھی درد سے خالی بے اثر اور محض بے کیف معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اور غزل سرائی کے لئے ضرور ہے کہ واردات قلبیہ اور تاثیر امور ذہنیہ حوالۂ قلم کئے جائیں۔ اس طرح کی شاعری کے لئے شاعر کو اپنا عالم درونی کافی ہوتا ہے اسے کوئی حاجت نہیں ہے کہ اپنے احاطہ ذہنیہ سے باہر جائے۔ اس کا ذہن ہی اس کی دنیا ہوتی ہے اس کے اندر وہ سب کچھ دیکھتا ہے اور جو کچھ دل کی آنکھ سے دیکھتا ہے اسے حوالۂ قلم کرتا ہے۔ جتنے اس کے کلام ہوتے ہیں اس کے واسطے کلیات کا حکم رکھتے ہیں۔ گو اس کے وہ کلام کلیات کے طور پر دیگر افراد انسانی کے لیے امور ذہنیہ اور واردات قلبیہ پر بھی شاہد آئیں۔[1]

بنیاد دستور و اثر اس امر پر منحصر ہے کہ غزل سرائی کو عالم خارج سے بہت کم تعلق ہوتا ہے ایسی شاعری خصی انداز رکھتی ہے چنانچہ بقول ان کے غزل سرائی کے لئے یہ خود سرائی کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے۔ غزل کے شاعر کے لئے ضروری ہے کہ وہ جو کچھ بھی موزون کرے اس میں اپنے کو نہ بھولے اور اپنے شخصی و غیر شخصی کو قائم نہ کرے ورنہ اس کا کلام بے تاثیر ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید نقادوں نے شاعری میں انفرادی لے کی جو توضیح کی ہے اس کی سب سے نکھری ہوئی شکل غزل میں ہی نظر آتی ہے۔ یونانی شاعرہ سافو (SAPPHO) غالباً دنیا کی سب سے پہلی غزل گو تھی اس بات پر سب ہی مورخ متفق ہیں کہ اس کی غزل سرائی ایسی پر تاثیر تھی کہ اہل یونان بقول اثر کے اس کے کلام پر فدا تھے۔ سافو کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے اثر نے ایک بڑے نکتہ کی بات کہی ہے ہم ان کی رائے سے اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن ان کا نظریۂ غزل گوئی کسی حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ مرتبہ سید امداد امام اثر، کاشف الحقائق، مرتبہ ڈاکٹر وہاب اشرفی، ص ۱۳۱، ۱۳۲

" تمام اصناف شاعری میں غزل گوئی ایک دشوار شے ہے اس میں شعر دل پر درد درکار ہے جس کو فطرت نے قلبی نعمتوں سے محروم رکھا ہے زنہار غزل گوئی کا قصد نہ کرے ۔ اس صنف شاعری پر شعر میر تقی میر صاحب کی خستگی اور مرزا نوشہ کی نشتریت درکار ہیں یوں تو ہر شعر غزل گوئی کرلیتا ہے مگر واقعی غزل گوئی کیا ہے اس کو دل جانتا ہے زبان بیان نہیں کرسکتی ۔ بہت سے حضرات غزل لکھنے بیٹھتے ہیں اور قصیدہ کہہ اٹھتے ہیں ۔ ما شاء اللہ ایسے حضرات کا کیا کہنا زور طبیعت ہے کہ انہیں کہاں سے کہاں لے جاتا ہے ۔ حقیقت حال یہ ہے کہ ان حضرات کو یا فطرت نے نعمت شعر قلبی سے محروم رکھا ہے یا ان کو ابھی تک اس نعمت شعر قلبی سے متمتع ہونے کا موقع نہیں ملا ہے ۔ اہل واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ غزل گوئی محض بے اختیار نہیں ہے ۔ ہر شاعر غزل گو نہیں ہوسکتا نہ خود بخود سچا شاعر غزل گو ایسی قدرت رکھتا ہے بجا ہے غزل گوئی کرے اشعار موزوں کرنا اور ہے اور سچی کیفیت قلبیہ کے ساتھ کچھ کہنا اور ہے "[1]

یونانیوں کے بعد یورپ میں اہل روم کا ستارۂ اقبال بلند ہوا ۔ ان کی شاعری میں رزمیہ ، مرثیہ ، ہجو اور بیانیہ شاعری کو ترقی ہوئی لیکن غزل سرائی میں اور عشقیہ شاعری وہاں زیادہ مقبول نہیں ہوسکی ۔ تاریخی اعتبار سے علم و ادب میں یونانیوں اور رومیوں کے انہیں اہل عرب ہوئے اس لئے ان کی شاعری پر اثر کا تبصرہ قابل غور ہے ۔ انہوں نے حالی او بھی بے مقابلے میں زیادہ نعمت سے کام لے کر کہا ہے کہ " ملک عرب اپنی ساخت کی رو سے ایسا ملک نہیں ہے کہ شاعری کے واسطے مخلوق ہوا ہو " جب عربوں کا اثر عربی شاعری پر پڑا تب کچھ تغیر پیدا ہوا ورنہ عربی شاعری قصیدہ اور مرثیہ سے آگے نہیں بڑھ سکی ۔ عربوں کی شاعری میں اونٹوں ، گھوڑوں ، ٹیلوں ، صحراؤں اور ریگستانوں کا ہی ذکر ملتا ہے ۔

---

۱ ۔ مرتبہ سید امداد امام اثر ، کاشف الحقائق ، مرتبہ ڈاکٹر وہاب اشرفی ، ص ۱۴۲ ، ۱۴۳

غزل کی نازک صنف کے لئے سرزمین ایران کو ہی قدرت نے بنا رکھا تھا کیونکہ ایران اور اس کے بعد ہندوستان میں اس صنف کو جو ترقی ہوئی اور اسے جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ ادب کی تاریخ میں بے مثل ہے۔

"کاشف الحقائق" حصہ دوم میں فارسی اور اردو شاعری پر بحث کرنے سے پہلے اثر نے تمام اقسام سخن تاریخی پس منظر میں بحث کی ہے چونکہ اردو اور فارسی شاعری کا بہتر سرمایہ غزل پر منحصر ہے لہذا انہوں نے اس صنف پر بڑی اہمیت سے بحث کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ عربی میں غزل گوئی تقریباً ناپید ہے۔ عجمی شاعروں نے جس زبان میں غزلیں لکھی ہیں وہ زبان ایجاد ہی لئے ایجاد ہیں۔ فارسی اور اردو دونوں ایسی زبانیں ہیں جن میں بہت گہرا تعلق ہے۔ اثر نے غزل سے ملتی جلتی انگریزی شاعری میں ایک صنف "سانٹ" کا بھی ذکر کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ یہ صنف غزل گوئی سے مشابہت رکھتی ہے مگر اس پر غزل گوئی کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا ہے۔ کلیم الدین احمد کی کتاب "اردو شاعری پر ایک نظر" کے دیباچہ میں پروفیسر محمد فضل الرحمن نے غزل کو جاپانی شاعری کی ایک صنف "ہائکو" سے قریب بتایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غزل پر کچھ از سانٹ یا ہائکو میں مل سکتے ہیں مگر غزل اس مشابہت کے باوجود اپنی مخصوص انفرادیت رکھتی ہے۔ اطالوی شاعری پترارک کے زمانے سے انگریزی شاعر روزتی کے زمانے تک انگریزی کے بیشتر اہم شاعروں نے جن میں شیکسپیئر، ملٹن اور ورڈس ورتھ بھی شامل ہیں سانٹ لکھے۔ صوری اور معنوی حیثیت سے اطالوی اور انگریزی سانٹ میں کئی تجربے ہوئے اور اس میں بڑی وسعت بھی ہوئی۔ اس کے باوجود غزل کو سانٹ نہیں کہا جا سکتا اس طرح جاپانی شاعری میں ہائکو کو منظر نگاری اور شاعر کے شخصی جذبات کے اظہار کے لئے استعمال کیا جاتا ہے مگر اس میں مشابہت گمراہ کن ہو سکتی ہے۔ ہائکو کے اثرات محدود ہیں لیکن اس میں وہ ربط نہیں جو اکثر غزلوں میں ملتی ہیں۔

غزل کی دوسری ملکوں میں مروجہ شعری اصناف سے مقابلہ اور اس کی مختصر تاریخی پس منظر

کے بعد اثر غزل کے لغوی معنی سے بحث کرتے ہیں ان کا قول ہے کہ غزل کے لغوی معنی عورتوں سے کلام کرنا ہے مگر اصطلاحاً اس سے شاعری کی وہ صنف مراد ہے جس میں ایسے مضامین جو اعلیٰ درجے کے واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ پر مشتمل ہیں حوالۂ قلم کئے جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"یہ صنف شاعری تمامتر داخلی پہلو رکھتی ہے۔ اس لئے اس کا احاطہ بہت محدود ہوتا ہے چونکہ اس صنف کا یہی تقاضا ہے کہ امور داخلی کے سوا امور خارجی قلم بند نہ ہوں اور اگر ہوں بھی تو داخلی پہلو کی آمیزش سے خالی نہ ہوں اس لئے یہ صنف شاعری دشوار رنگ رکھتی ہے۔ ذرا سی لغزش سے غزلیت کا رنگ اڑتا رہتا ہے۔ کلام مبہم و نما ہوجاتا ہے یا مبتلائے سست خیالی ہوکر احاطۂ شاعری سے نکل جاتا ہے۔ غزل گو کی شان یہ ہے کہ وہ اعلیٰ قسم کا دل و دماغ رکھتا ہے اور خلقت کی رو سے آزاد طبیعت مالک طینت، شوخ مزاج، نازک خیال، گداختہ دل اور برختہ گر ہو۔"[1]

اثر نے غزل کی انفرادیت سے بحث کرتے ہوئے اسے بہر نکاتی منشور بھی جاری کیا ہے جسے وہ ہدایت نامہ متصور کرتے ہیں۔ ان نکات کی تلخیص حسب ذیل ہے۔

(۱) ادائے مطلب کے لئے غزل گو کی زبان کو سلیس ہونا چاہئے۔

(۲)۔ جس قدر ممکن ہو زبان کی سادگی ملحوظ رہے اور صنائع بدائع سے احتراز کیا جائے۔

(۳)۔ جہاں تک ممکن ہو غزل میں تشریح و استعارہ دخل نہ پائیں کیونکہ یہ چیزیں شاعر کے عجز طبیعت سے خبر دیتی ہیں۔

۱۔ مصنفہ سید امداد امام اثر، کاشف الحقائق، مرتبہ ڈاکٹر وہاب اشرفی، ص ۳۶۹ و ۳۷۰

(٤) ۔ مبالغہ پردازی سے جس قدر اجتناب ممکن ہو عمل میں لایا جائے ۔

(۵)۔ اگر تشبیہ و استعارہ اور مبالغہ سے بھی کام لیا جائے تو ان کا استعمال فطری خوبیوں کا محل واقع نہ ہو ۔

(٦) ہیئتی ، ضلع گت وغیرہ سے اجتناب واجبات سے ہے ۔

(۷)۔ رعایت لفظی یا تو ارد ہو یا محض طبعی انداز رکھتی ہو ۔ ایسا نہ معلوم ہو کہ رعایت لفظی کا کوئی اہتمام کیا گیا ہو ۔

(۸)۔ غزل کے تغیر مضامین ہوں داخلی ہوں مگر ایسے رفیع درجے کے ہوں جس سے انسان کے عالم باطن کا شرف ظاہر ہوسکے اور جن سے انسان نمونۂ قدرت خداوندی سمجھا جائے ۔

(۹)۔ مضامین عشقیہ ایسے نہ ہوں کہ معشوقان بازاری کی طرف محمول کئے جاسکیں ۔ فسق و فجور سے تمامتر بے لگاؤ ہو ۔ اعلیٰ عشقیہ شاعری حسن و جمال خداوندی پر مبنی ہونا چاہئے ۔ بد مذاق غزل گو گویوں کی شاعری کم بینی ، خیرہ چشمی ، بے حیائی ، بد خلقی ، بد نفسی اور فرومائگی کا اظہار کرتی ہے ۔

(۱۰) وصال و فراق کے مضامین فطرت کے احاطہ سے باہر نہ جائیں ۔

(۱۱) وصال و فراق کے بیانات بے حیائی کے ساتھ رقم نہ ہوں ۔

(۱۲) ہوا و ہوس ، حسرت ، رنج ، ملال ، عداوت ، رشک ، جنون ، وحشت ، رغبت ، نفرت ، حسد اور غرور وغیرہ کی بندشیں ایسی نہ ہوں کہ مذاق صحیح سے عاری ظاہر ہوں ۔

(۱۳) کوئی خیال پستی کی طرف مائل نہ ہو ۔

(۱٤) شوخی ضبط ضروریات کلام سے ہے مگر شوخی سے مراد بے حیائی نہیں ۔ ان دونوں میں تمیز لازم ہے ۔

(۱۵) مکروہ مضامین سے اجتناب واجبات سے ہے۔

(۱۶) غزل گوئی کے لئے اشد ضروری ہے کہ اس میں واردات قلبیہ ہی قلم بند ہوں۔

(۱۷) غزل گو شاعر کو چاہئے کہ تبیعت فطرت کو ہمیشہ ملحوظ رکھے۔

(۱۸) مضامین حشمت آگین شاعری کے زیور میں قلم بند کئے جائیں۔

(۱۹) غزل میں عاشق مزاجی واجب ہے مگر بازاری عشق کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔

(۲۰) غزل گو کا فرض منصبی ہے کہ قرب سلطانی سے تاحد امکان کنارہ کش رہے۔

امداد امام اثر کے بیس نکاتی منشور پر سرسری طور پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بعض خصوصیات کو محض الفاظ بدل کر دہرا دیا ہے اور بعض کی توضیح کی جگہ بدل دی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ غزل کے مضامین کے لئے واردات قلبیہ اور کیفیات ذہنیہ کو جتنا اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک غزل کے مضامین کا داخلی اور اخلاقی ہونا ضروری ہے۔ جو اثر کے غزل بازاری فن کی رکاکت، ہوا و ہوس اور بے حیائی کے مضامین کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اسلوب بیان کی حد تک ان کا خیال ہے کہ غزل کی زبان سلیس اور طرز ادا فطری ہونی چاہئے۔ اس لئے وہ تشبیہات و استعارات، صنائع بدائع، صنعت گری اور رعایت لفظی سے اجتناب کی تلقین کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر ان کا نقطۂ نظر اخلاقی ہے کیونکہ بقول اثر ــــ

"غزل کو ایسا ہونا چاہئے جس سے انسان کی بزرگی اور عظمت ہویدا ہو سکے
جس سے انسان کا دل عرفان اللہ تعالیٰ ثابت ہو سکے"[1]

ظاہر ہے کہ یہ حکم غزل جیسی صنف کے سلسلے میں نہیں لگایا جا سکتا۔ اگر کامیاب غزل کے لئے اس مقولہ کو معیار قرار دیا جائے تو اردو کے بڑے سے بڑے غزل گو شاعروں کے کلام میں زبردست انتخاب کی ضرورت پڑے گی۔

دیدہ تنقید کی روشنی میں ہم اثر کے ہدایت نامے کو اتنے لئے قابل قبول نہیں پاتے ہیں

۱۔ مخفف سید امداد امام اثر، کاشف الحقائق، مرتبہ ڈاکٹر وہاب اشرفی، دیکھئے مقدمہ کاشف الحقائق (ڈاکٹر وہاب اشرفی) ص ۳۲، ۳۴

عام طور پر غزل کی زبان سلیس ہوتی ہے اور یہ سخت متقدمین کی اہم خصوصیت تھی لیکن غالب اور ان کے بعد کئی دوسرے شعرا نے مشکل زبان اور مشکل زمین میں غزلیں کہیں۔ صنائع بدائع سے غزل کی شاعری کو بالکل پاک نہیں رکھا جاسکتا اس لئے کہ یہ صنف سخن بیانیہ نہیں بلکہ اشارے کنایہ کی زبان لے کر ہی ترقی پاسکی۔ اس طرح تشبیہ و استعارہ یا لفظی مضمون کے بغیر اچھی غزل کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اثر نے خارجی بہ سے مغلوب ہوکر یہ ہدایت نامے جاری کردئے۔ حقیقت یہ ہے کہ رعایت لفظی، صنائع بدائع، تشبیہ و استعارہ، محاورہ و ضلع جگت کے بغیر غزل مفلوج ہوکر رہ جائے گی۔ اثر کی حمایت میں ہم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے استعمال میں حد سے زیادہ تجاوز نہیں کرنا چاہئے۔

جہاں تک غزل کے مضامین کا تعلق ہے اثر نے اپنے منشور میں بہت ہی محدود نظریہ اختیار کیا ہے۔ سانٹ اور لیرک کی طرح غزل کا دامن بھی خاصا وسیع ہوچکا ہے۔ غالب نے روایتی غزل کو اپنے فکر و فن سے کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ ان کے بعد غزل کے اندر سیاسی، تمدنی، معاشرتی اور دوسرے مضامین بھی اشارے کنایہ میں شامل کئے جاتے رہے ہیں۔ اقبال، حسرت اور فیض کی غزل کوئی اس کی زندہ مثال ہے۔ وصال و فراق کے مضامین اب مسلسل استعارہ کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ بہرحال اس سے انکار نہیں کہ سست خیالی، بے حیائی، فحاشی اور رکاکت سے غزل میں سستی لذت تو آسکتی ہے مگر اس کی روح بھی مجروح ہوسکتی ہے۔ مکروہ مضامین کے سلسلے میں جو باتیں اثر نے کہی ہیں وہ کچھ زیادہ قابل قبول نہیں۔ غزل میں اثر کا عشق و عاشقی سے متعلق نظریہ افلاطونی اور اخلاقی ہے۔ اس ہے کہ جدید شعرا رانی لکھنے کے فقیر نہیں ہوتے اس لئے غزل میں نئے نئے پہلو ہر نئی نسل کے شاعروں کے یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ بہرحال ہم اثر کے ہدایت نامے کو یکسر رد بھی نہیں کرسکتے۔ ان کی اپنی تاریخی اہمیت ہے اور ان نکات کو اثر کے مخصوص

ذہنی افتاد ، ادبی روایت اور اخلاقی فکر کی روشنی میں دیکھنا چاہئے۔

اثر کی تنقید کا بہترین حصہ وہ ہے جہاں وہ فارسی اور اردو کے شعرائے آفاق مشاہیر کے کلام پر تبصرہ کرتے ہیں۔ فارسی میں وہ طلعت حافظ ، سعدی ، جامی ، فغانی ، خسرو ، ابوطالب کلیم ، بیدل اور غالب کے قائل ہیں مگر غالب غزل میں وہ خواجہ حافظ کو بے مثل قرار دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ بقول ان کے سعدی بھی اس منزل کو نہیں پہنچتے۔ خواجہ حافظ تمام تر داخلی مذاق رکھتے تھے اس وجہ سے ان کے کلام میں ایک مخصوص تاثیر پائی جاتی ہے۔ سعدی داخلی اور خارجی دونوں طرح کے مضامین پر حاوی ہیں ان کے یہاں دلفریبی ، شوخی اور شیرینی بھی ملتی ہے مگر ان کا دیوان ——

" خواہ کے دیوان کی طرح انتخاب کا حکم نہیں رکھتا "[1]

فارسی غزل گوئی کے باب میں اثر نے جن شعرا کا حافظ و سعدی کے علاوہ ذکر کیا ہے وہ ہیں جامی ، فغانی ، خسرو ، اہلی شیرازی ، کلیم ، علی حزین ، صائب اور غالب وغیرہ۔ ان شعرا کی ایک ایک دو دو غزلیں سامنے رکھ کر ان کی غزل گوئی سے ہمیں متعارف کرایا ہے۔ مثلاً جامی کے متعلق اثر لکھتے ہیں کہ وہ مذاق غزل گوئی رکھتے ہیں مگر ان کے دیوان کی تمام غزلیں یکساں طور پر اعلیٰ معیار کی نہیں۔ اثر بابا فغانی کی غزل سرائی کے بھی مداح ہیں لیکن صرف ایک غزل کی بنا پر ان کی رائے کچھ زیادہ وقیع نہیں۔ خسرو کے متعلق لکھتے ہیں کہ اگرچہ خسرو بہت اچھی غزل گو ہیں لیکن ان کے دیوان میں حافظ کی طرح غزلیت نہیں ہے۔ لیکن اہلی شیرازی ، میلی ، ہمدانی کلیم اور جلالی و حزین کے کلام کے متعلق انہوں نے سرسری رائے ظاہر کی ہے۔ ہندوستان کے دوسرے فارسی غزل گو شعرا کے بارے میں ان کا رویہ اندازہ ہے۔ بیدل کے کلام اثر کو کچھ زیادہ پسند نہیں ہوا کہ وہ غزلوں میں ایسے ایسے استعارات اور نازک خیالات سے کام لیتے ہیں کہ غزل سرائی کا لطف قائم نہیں رہتا۔ مرزا مظہر جانجاناں کا کلام اچھا ہے مگر اس درجے کا نہیں ہے کہ ان کا شمار ممتاز غزل گو

۱۔ مصنفہ سید امداد امام اثر ، کاشف الحقائق ، مرتبہ ڈاکٹر وہاب اشرفی ، ص ۲۸۴

میں کیا۔ اثیر۔ خان آرزو اب محقق شخص ہیں جو شاعری کے لئے موزوں نہیں تھے۔ قتیل میں غزل سرائی کا مادہ ہے مگر وہ اس صلاحیت کو پوری طرح بروئے کار نہ لاسکے۔ غالب پر متعلق اثر کی تنقید کی اقدار قابل قبول ہیں۔

" ..... غالب فارسی کے اچھے غزل سرا نظر نہیں آتے۔ شعر نہیں دے غالب کو فارسی کی معلومات بہت ہے اور شاعری کا مادہ بھی بہت رکھتے تھے مگر ان کی فارسی کی غزل سرائی غزل سرائی کا حکم نہیں رکھتی ہے۔ ہر غزل و دیگر انہی مضمون آفرینی خیالی سخن پردازی نازک خیالی زور آوری وغیرہ عیاں ہے۔ مگر انہی تمام فارسی غزلوں میں صرف دس پانچ ہی ایسی ہونگی جو غزلیت کا لطف رکھتے ہوں ورنہ دیوان کا دیوان حد مقبولیت سے خالی نظر پڑتا ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ استعارات وغیرہ سے بہت کام لیتے ہیں جو سچی غزلگوئی کی شان سے بہت بعید ہے"[1]

اردو غزل کی تنقید۔

فارسی غزلگو شعراء پر سرسری تبصرہ و تنقید کے بعد اب اردو کے مشاہیر غزل گویوں کو معرض بحث میں لاتے ہیں۔ شعراء کے نام پر تبصرہ سے پہلے وہ اس امر کا اعادہ کرتے ہیں کہ اردو شاعری بالخصوص غزل کے دو اہم دبستان ہیں یعنی دہلی اور لکھنؤ۔ اکثر اثر کے پہلے آزاد اور حالی نے بھی ان دونوں دبستانوں کا اپنی تصانیف میں ذکر کیا ہے لیکن جس قطعیت سے اثر نے دہلوی اور لکھنوی غزلگو شعراء کی خصوصیات بیان کی ہیں وہ ان کا اپنا حصہ ہیں۔

" ..... دہلی کے حضرات متغزلین اکثر اپنی غزل سرائیوں میں

۱۔ سید امداد امام اثر ۔ کشف الحقائق ۔ مرتبہ ڈاکٹر وہاب اشرفی ۔ ص ۳۹۲

شاعری کا داخلی پہلو ملحوظ رکھتے کثیر ہیں ۔ اس سبب سے ان کی غزل سرائیاں تقاضائے تغزل کے مطابق پائی جاتی ہیں ۔ میر حسن ، خواجہ میر درد ، میر تقی میر ، سودا ، مومن ، غالب یہ سب شعرائے متغزلین اپنی داخلی رنگ برتنے والے گزرے ہیں ۔ البتہ ذوق اور جو داخلی پہلو کے برتنے والے نہ تھے تو بھی وہ خارجی پہلو سے آمیزش داخلی پہلو کے ساتھ اس رنگ سے کرتے ہیں کہ ان کا کلام سنجیدہ ہونے سے بچ جاتا ہے ۔ برخلاف اس کے لکھنؤ کی غزل کوئی نا رنگ نظر آتا ہے ۔ اس جگہ کے اکثر شعرائے نامی غزل سرائی میں خارجی پہلو اختیار فرماتے ہیں یعنی واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ کی قید کی پابند نہیں رہے ہیں بلکہ تقاضائے غزلگوئی کے خلاف خارجی مضامین کو اپنی غزل سرائیوں میں زیادہ جگہ دیتے کثیر ہیں ۔ اس بدولت سے احاطہ غزل تو وسیع ہوگیا مگر غزل سرائی سے جو غزل متصور ہے فوت ہوگئی "[1]

اردو غزل کے اہم ماہر (وہ دہلی سے لیکر رند لکھنوی تک) پر امداد اثر کے تاثرات اور ان کی تنقید قابل لحاظ ہے ۔ انھوں نے واردات قلبیہ کو غزل کی سب سے اہم خصوصیت قرار دیکر اس کو معیار بنایا ہے اور اس کی روشنی میں اساتذہ کے کلام پر تبصرہ کیا ہے ۔ دوسری بات یہ ہے کہ انھوں نے مدرسۂ دہلی کے استادوں کی سب سے اہم خصوصیت " داخلیت " قرار دی ہے اور دبستان لکھنؤ کے شاعروں کی اہم خصوصیت " خارجیت " بتائی ہے ۔ میر تقی میر غزل میں داخلیت کے امام ہیں اور ناسخ اردو غزل میں خارجیت کے سب سے اہم نمائندہ ہیں ۔ ہمیں اثر کے ان خیالات سے اتفاق ہو یا نہ ہو یہ بات ماننی

---

۱ ۔ سید لطف امداد امام اثر ، کشف الحقائق ، مرتبہ ڈاکٹر وہاب اشرفی ، ص ۸۶

ثروت کی کہ انھون نے بحر معنون مین آزاد اور حاسی سے بھی زیادہ باریک بینی اور کلام فہمی کا ثبوت دیا ہے وہ بہ وقت غزل کے مضامین اور طرز ادا کی خوبی آہنگی پر زور دیتے ہین اور رکاکت و فحاشی سے اجتناب کی سخت تلقین کرتے ہین ۔ اگرچہ ان کے تنقیدی ساز و سامان روایتی معلوم ہوتے ہین لیکن کاشف الحقائق مین اردو غزل کی تنقید کے ایسے نکات بھی سامنے آتے ہین جن سے بیسوین صدی کے نقادون نے استفادہ کیا ہے

ولی دکنی بقول اثر اگر غزل کے موجد نہین ہین تو اردو غزل گوئی کو درجۂ امتیاز بخشنے والے ضرور ہین ۔ ان کی غزل گوئی مین داخلی پہلو اہم ہے اور وہ غزل کے فنی تقاضون سے بھرپور واقفیت رکھتے ہین ۔

" غزل گوئی کے اعتبار سے ولی اول درجے کے شاعر تھے جو غزلگوئی کے تاثیر ہین ان سے ولی کو بھرپور اسلوب حاصل تھی چنانچہ غزلگوئی مین بیشتر اعری کا داخلی پہلو محسوس رکھتے تھے اس لئے ان کی غزل سرائی پر تاثیر نظر آتی ہے "[1]

اس کے بعد ولی دکنی پر کلام و تبصرہ کرتے ہوئے ان کے تنوع کلام کی طرف بھی ہماری توجہ مبذول کرائی ہے ۔ اردو نقادون مین غالباً وہ پہلے نقاد ہین جنھون نے ولی دکنی کی تاریخی اہمیت کا احساس دلایا ۔

" سب غزل [illegible] سراپا نامی نے حسب استعداد ذاتی ان کی اعری سے ہدایت لی ہے ۔ ولی کے کلام مین درد ، سودا ، میر ، مصحفی ، ذوق ، ناسخ ، آتش سب کے رنگ بکثرت موجود ہین اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی کس قدر قوی و اندماج شاعر تھے جو ہر فن کے کلام پر قدرت تامہ رکھتے تھے ۔ حقیقت یہ ہے کہ مابعد کے بہتیرے متغزلین موجد کے طرز کے پیرو کہلاتے ہین ۔ در حقیقت اس پیر طریقت کے مرید ہین

۱۔ سید امداد امام اثر ، کاشف الحقائق ، مرتبہ ڈاکٹر وہاب اشرفی ، ص ۴۰۹
۲۔ ایضاً

مرزا رفیع سودا کے قدرت بیان سے اثر بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کے بقول سودا مضامین داخلی اور خارجی دونوں کی بندش پر اچھی قدرت رکھتے تھے۔ غزل گوئی کی حد تک ان کا کلام مخصوص اہمیت کا حامل ہے۔

"ہرچند وہ اس صنف شاعری میں میر صاحب کے برابر نہیں ہیں۔ اس پر بھی وہ اس صنف شاعری کے بھی ایک بڑے استاد ہیں۔ ان کا کلام درد، سوز و گداز سے خالی نہیں ہے اور یہ وہ صفتیں ہیں کہ جو غزل سرائی کی جان ہیں۔ میر صاحب کی طباعی، طبیعت داری، شوخی، نازک خیالی، مضمون آفرینی بہت قابل لحاظ ہیں۔"[1]

امداد امام اثر کی تنقید کا ایک خاص رنگ ہے۔ وہ اکثر اوقات تجزیے کے بجائے شدید تاثر کا اظہار کرتے ہیں۔ "واللہ کیا طرز کلام ہے" یا "سبحان اللہ کیا حسن کلام ہے" وہ ایسے ہر شدید، شاعر کو داد سخن دیتے ہوئے بے قابو سے ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی مبالغے کی حد تک بھی آگے بڑھ جاتے ہیں مثلاً ذیل میں ان کا یہ قول کہ

"اگر مرزا سودا انگلستان میں ہوتے تو دوسرے شکسپیر ہوتے"

دبستان دہلی کے مشہور غزل گو شعراء خواجہ میر درد اور میر تقی میر کے کلام پر اثر کی تنقید مختصر لیکن بے حد تجزیاتی اور معنی خیز ہے خواجہ میر درد کے متعلق لکھتے ہیں۔

"خواجہ صاحب کی غزل سرائی نہایت اعلیٰ درجے کی ہے۔ سوز و گداز میں ان کے جواب یا میر تھے یا آپ اپنے جواب تھے۔ واردات قلبیہ کے مضامین ایسے باندھتے تھے کہ سودا تک نہ پہنچتے تھے۔ عدوہ اس کے خود طبیعت جو نہایت پر درد واقع ہوئی ہے اس کا اثر ان کے کلام میں بدرجہ کثیر پایا جاتا ہے۔ ہرچند خواجہ کا دیوان مختصر سا ہے مگر قریب قریب انتخاب کا حکم رکھتا ہے۔"[2]

۱۔ سید امداد امام اثر، کاشف الحقائق، مرتبہ ڈاکٹر وہاب اشرفی، ص ۴۱۱
۲۔ ایضاً، ص ۴۱۴

اثر نے درد کے کلام کی تاثیر بہت اچھی طرح واضح کی ہے۔ سوز و گداز، درد اور خستگی ہر ان کے کلام میں "بے نفسی کی جلوہ گری قابل لحاظ ہے" اثر خواجہ درد کی غزل سرائی کو الہامی شاعر کا نمونہ کہتے ہیں جس میں نزاکت، متانت، شیرینی، ملاحت اور رنگینی کے علاوہ تاثیر کی وہی بھی موجود ہے۔ انہیں مخصوص انداز میں اثر انہیں ہم عصروں کے ایک طبقے کی بستی مذاق کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "وہ ناپاک شوخی جو مسبق علیہ عوام ہوتی ہے اس کی جھلک بھی خواجہ صاحب کے کلام میں نہیں پائی جاتی"۔

امداد امام اثر غالباً پہلے نقاد ہیں جنہوں نے میر تقی میر کی عظمت کا صحیح احساس دلایا۔ میر بقول اثر کے "سلطان المتغزلین" ہیں۔ میر کے کلام کے چھ دیوان ہیں اور اثر ان کے منتخب کلام کو اظہار رائے کرتے ہوئے ان کی انفرادیت کو نمایاں کرتے ہیں۔ غزل میں میر کا اپنا مخصوص رنگ ہے اور اس کی تقلید ناممکن ہے۔ ان کے کلام کی تاثیر کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ غزل سرائی میں کبھی واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ کے احاطے سے باہر قدم نہیں رکھتے۔

"میر صاحب کی غزل سرائی تمامتر اعلیٰ داخلی پہلو رکھتی ہے۔ تبھی تو ان کے کلام میں سوز و گداز، خستگی، نشتریت، رنگینی، ملاحت، شیرینی، شوخی وغیرہ کی کیفیتیں بدرجہ کثیر پائی جاتی ہیں"[1]

اثر نے میر اور درد کے کلام کا موازنہ بھی کیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں شاعروں کی خصوصیات کو واضح کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ خواجہ صاحب کے کلام میں میر کے کلام کے اعتبار سے خستگی کم ہے۔ لیکن سوز و درد خواجہ صاحب کا میر صاحب سے بڑھا ہوا ہے۔ نظر آتا ہے۔ درد کے یہاں پاکیزگی، نفاست اور ملاحت ہے تو میر کے کلام میں دل کی خستگی، محزونی اور نشتریت درد کے کلام سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگرچہ دونوں شعراء غزل گوئی میں یہ مثل ہیں لیکن قوت شاعری کے اعتبار

۱۔ سید امداد امام اثر، کاشف الحقائق، مرتبہ ڈاکٹر وہاب اشرفی، ص ۴۱۷

میر میر کو درد پر فوقیت حاصل ہے۔

اثر نے میر کے کلام کا جو انتخاب کیا ہے وہ انہی جذبہ نمایندہ ہے کیونکہ ان اشعار سے بھی ناری میر کے انداز کلام کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ زبان کی سادگی اثر کے مذاق نامے میں سب سے اہم نکتہ ہے۔ میر کا کلام اس سادگی کا بہترین نمونہ ہے۔

" واقعی کیا کیا دشوار مضامین کو جو محض قلب و ذہن سے متعلق ہیں میر صاحب ایسی آسانی اور خوبی اسلوبی کے ساتھ بیان فرما جاتے ہیں کہ عقل دھنگ ہو جاتی ہے ان کی سادگی زبان کا عالم فی الحقیقت نرالا ہے۔ بیان مضامین بیشتر تشبیہہ استعارہ اور مبالغہ سے احتراز رکھتا ہے اور اگر کہیں ان صنعتوں کو دخل بھی دیتے ہیں تو اس خوبصورتی سے کہ آورد کی کیفیت مطلق ظاہر نہیں ہوتی ہے۔ "[1]

انیسویں صدی میں دبستان دہلی کے اہم غزل گو شاعروں میں مومن ذوق اور غالب بلاشبہ اپنے اپنے فن کے استاد ہیں۔ اثر نے تینوں کو اس عصر شاعروں کی انفرادیت ان کے مشہور کلام کی روشنی میں متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ مومن کے متعلق لکھتے ہیں۔

" مومن کی اتنی غزلیں ہیں ایسی ہی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ مومن کی غزل سرائی دہلی کی غزل سرائی کا طور رکھتی ہے۔ غزل سرائی میں مومن ہی واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ کے مضامین حوالہ قلم کرتے ہیں گو ان کے بیان میں خواجہ درد یا میر صاحب کے کلام کی برتاثیری پائی نہیں جاتی ہے۔"[2]

اثر مومن کو ایک بڑا شاعر تسلیم کرتے ہیں اور ان کی تعریف میں یہ بھی کہہ جاتے ہیں کہ ان کی غزل سرائی پر اہل دہلی کو ناز ہونا چاہئے۔ ساتھ ہی ان کے کلام کی

۱۔ سید امداد امام اثر، کاشف الحقائق، مرتبہ ڈاکٹر وہاب اشرفی، ص ۲۳ ۴
۲۔ ایضاً

کی خامیوں کی پیچھے طرف بھی اشارہ کرتے ہیں ۔ مومن کی غزل گوئی کی تعقیدات کی طرف وہ خاص طور پر اشارہ کرتے ہیں کیونکہ بندش کی لغزش سے اکثر اوقات ان کا کلام مبہم رہ جاتا ہے ۔

ذوق دہلوی کے بارے میں اثر نیر جو کچھ لکھا ہے وہ بھی تلخ تنقید کا بہترین نمونہ ہے وہ آزاد کی طرح ملک الشعرائی کا تاج ذوق کے سر پر رکھنا پسند نہیں کرتے کیونکہ ذوق کی شاعری غزل سرائی کے تقاضوں کے مطابق معیار پر پورے نہیں اترتی ۔ ان کے کلام میں نہ میر تو میر و درد کا سوز ہے اور نہ مومن و غالب کی پرکیف معنویت ۔

" ان کی غزل سرائی حضرات اہل لکھنؤ کی غزل سرائی سے زیادہ مطابقت نہیں آتی ہے اور اس لئے ان کا کلام ان کے معروف شعرائے وطن کے کلاموں سے علحدہ انداز رکھتا ہے ..... اس لئے ان کی غزلیں باوجود عالی خیال وغیرہ کے وہ تاثیر قلبی پیدا نہیں کرتی جس کی متمنی غزل سرائی ہے "[1]

اگرچہ اثر نیر ذوق کے کلام کی بے کیفی کے لئے خارجی مضامین کی کثرت کو ذمہ دار بتایا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ذوق کا شہرت مرا غزل سے زیادہ قصیدے کے لئے موزوں تھا ۔ ان کی غزل گوئی میں وہ شگفتگی یا وارفتگی نہیں ملتی جو بیشتر اساتذہ کا خاصہ ہے ۔ البتہ کہیں کہیں غزل میں رفعت و جلالت ، مضمون خیزی اور بلند پروازی نظر آتی ہے مگر ان خوبیوں کے باوجود وہ ایسے خاص سماں سے اور نہیں اٹھتا ۔ اثر نیر ذوق کے کلام کی سلاست اور محاوروں کی آسانی کے ساتھ باندھنے سے لطف کلام میں اضافہ کا دعوی کیا ہے ۔

غالب کے کلام پر اثر نیر نہایت معروضی انداز میں تنقید کی ہے ۔ وہ غالب کی پسند اور اغلاق مضامین سے نالاں نظر آتے ہیں اور اضافتوں اور استعاروں سے شعر کو مشکل دیکھتے ہیں ۔ ان پر خیال میں غالب کے یہاں میر کی یاد کی بہت کم ہے لیکن

۱۔ سید امداد امام اثر ، کاشف الحقائق ، مرتبہ ڈاکٹر وہاب اشرفی ، ص ۴۲۹

بلند پردازی ، نازک خیالی ، شوخی اور نشتریت ہر جگہ موجود ہے۔ اثر غالب کو
" یکتائے روزگار " سخنور سمجھتے ہیں اور دل کھول کر داد تحسین دیتے ہیں۔

" واقعی یہ سوز ، گداز ، خستگی ، درد پرستی ، نشتریت ،
بلند پردازی ، نازک خیالی ، مکنت و ، تنانت ، جلالت ، تہذیب
شوخی غالب کے کلام میں ہے۔ باستثنائے درد میر کسی استاد کے
کلام میں نہیں ائی جاتی ہے۔ نشتریت تو ایسے غضب کی ہے کہ میر صاحب
کے کلام میں بھی اس سے زیادہ نہ ہوگی۔ پرتاثیری کا کیا کہنا
دل پر اختیار چلا اٹھتا ہے کہ غزل سرائی اسے کہتے ہیں۔ شوخی کا
وہ عالم ہے کہ طبیعت پر چین ہوجاتی ہے۔ عالی مذاقی روح کو
عالم بالا کی سیر دکھاتی ہے۔ واردات قلبیہ کے مضامین خوبی
سے باتی معاملات کے تماشے بھی دکھاتی ہے اور مختصر یہ ہے
کہ حضرت کے کمالات گوناگوں کا وہی قائل نہ ہوگا جسے قلبی نعمتوں
سے فطرت نے محروم رکھا ہے "[1]

حق تو یہ ہے کہ اثر نے غالب کے کلام کی خوبیوں کو نہایت اختصار کے ساتھ اجاگر کیا ہے
غالب کی جدید تنقیدان کے فکر و فن کے بیشتر پہلوؤں پر محیط ہیں لیکن کسیکی تنقید
میں اثر کو دراندازی نہیں کہا جاسکتا ۔ میر ، درد اور غالب کے کلام پر تقابلی نظر
ڈالتے ہوئے اثر انے مضمون نگاری کی تبلیغ کرتے ہیں کہ غزل میں عظیم شاعر وہی ہے جو
ساری داخلی مضامین پر اکتفا کرے۔ اس لحاظ سے وہ غالب کو میر اور درد کے بعد تیسرے
نمبر پر رکھتے ہیں۔

" حقیقت یہ ہے کہ استاد غالب اردو میں بڑے غزل سرا گزرے ہیں۔

۱۔ سید امداد امام اثر ، کاشف الحقائق ، مرتبہ ڈاکٹر وہاب اشرفی ص ۴۲۵

یوں تو ہیں عیب خدا کی ذات ہیں مگر اس پر بھی ان کی غزل سرائی
معائب غزل سرائی سے بہت کچھ پاک ہے۔ لاریب ان کی غزل سرائی
قریب قریب غزل سرائی کے تقاضوں کے موافق ہے۔ اگر غالب "درد"
یا میر درد اس صنف شاعری میں نہیں پہنچتے ہیں تو ان دونوں
استادوں کے بعد ان ہی کا درجہ ہے"۔[۱]

اگر کہیں ہے غالب کی عظمت محض ان معیاروں سے نہیں متعین کی جا سکتی جو اثر نے اپنے لئے مقرر کر رکھے ہیں۔ غالب اپنے انداز کا بے مثل شاعر ہے اور وہ یقیناً "ہندوستان ہی میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے صف اول کے شاعروں میں جگہ پا سکتا ہے۔

دبستان دہلی کے اہم شاعروں خصوصاً "غزل گو شاعروں پر تنقید و تبصرہ کے بعد اثر مدرسہ" لکھنؤ کے دو عظیم شاعروں یعنی شیخ ناسخ اور خواجہ آتش کے کلام کا جائزہ لیتے ہیں۔ اثر ناسخ کو صحیح طور پر اردو زبان کے مصلح کی حیثیت سے یاد کرتے ہیں کیونکہ ان ہی کوششوں سے اردو زبان ترقی کی منزلوں سے گزر کر لطافت اور صفائی سے ہمکنار ہوئی۔ شیخ ناسخ کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے اثر نے لکھا ہے کہ ان کی شہرت "مرد غزل سرائی" کی بنیاد پر ہے۔ وہ بنیادی طور پر غزل میں خارجی پہلو کو برتتے ہیں اس میں اگرچہ غزل کا دائرہ وسیع ہوگیا لیکن غزل سرائی کا مطلب فوت ہوگیا اور ایک ایسی قسم کی شاعری ایجاد ہوئی جس پر قصیدہ ہوتی اور غزل سرائی میں سے کوئی تعریف ادا نہیں آتی ہے۔ اثر کو ان نکتہ چینوں سے اتفاق نہیں ہے جو ناسخ کو سیاہ قلم کا شاعر سمجھتے ہیں کیونکہ بقول ان کے ان کے کلام میں نازک خیالی اور بلند پروازی کے علاوہ فصاحت و بلاغت بھی موجود ہے لیکن اکثر اوقات شاعری مضامین کو برتنے میں صنائع بدائع کے استعمال اور مبالغہ پردازی سے بھی شاعری غیر فطری ہوجاتی ہے۔ ناسخ کے سلسلے میں ایسا اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان کے یہاں کوئی شعر ایسا نہیں پایا جاتا ہے

۱۔ سید امداد امام اثر، کاشف الحقائق، مرتبہ ڈاکٹر وہاب اشرفی، ص ۴۴۳

سر سے سوچہ کردی کی بو نکلتی ہو ۔ وہ کبھی فسق و فجور کے معنا مین نہین باندھتے لہذا ان کا کلام بے حد تہ پاک ہے ۔

خواجہ حیدر علی آتش و ناسخ کے ممتاز ہم عصر تھے ۔ شاعری مین مدرسۂ لکھنؤ کے نمایندہ کی حیثیت رکھتے تھے یعنی ان کے یہان وہی رنگ غالب ہے جو شعرائے لکھنؤ کا خاصہ ہے ۔ اس کا ثبوت ہے کہ

" خواجہ آتش کی شعری محیط نہایت اعلیٰ درجے کی تھی اور اگر انھین لکھنؤ کا شعری ماحول نہین مل ہوتا یا شیخ ناسخ کے مقابلے مین اپنا رنگ نہین جمانا ہوتا تو شاید وہ اپنے دور مین غزل کے منفرد شاعر ہوتے "۔[1]

اثر نے آتش کی غزل سرائی پر تبصرہ کرتے ہوئے چند خصوصیات کا ذکر کیا ہے ۔ اول لطف زبان ، دوم محاورہ بندی ، سوم اعلیٰ درجے کے معنا مین کی بندش ، چہارم شوخی اور بانکپن ، پنجم فخر و آزاد مزاجی ، ششم کلام کا مردانہ رنگ ۔ یہ وہ خوبیان ہین جن کی بنا پر آتش اپنا مخصوص مقام رکھتے ہین ۔ یہی رنگ ان کے شاگرد سید محمد خان رند کے کلام مین بھی ملتا ہے ۔[1]

کاشف الحقائق کے متعلقہ غزل کے آخری حصے مین امداد امام اثر نے غزل کی حمایت مین چند باتین کہی ہین و لائق توجہ ہین ۔ اس سلسلے مین انھون نے غزل کے نام نہاد مصلحون کی بھی خبر لی ہے ۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ آزاد اور حالی کے مقابلے مین انگریزی ادب سے زیادہ واقفیت کے باوجود اثر نہ تو انگریزی دانشمندون سے مرعوب ہوتے ہین اور نہ نیچرل شاعری کو غزل سے مماثل ٹھہرانے پر آمادہ نظر آتے ہین ۔ انھین اس کا احساس ہے کہ ملکی شاعری مین خامیان ہین مگر وہ یہ بھی جانتے ہین کہ یورپین

۱۔ سید امداد امام اثر ، کاشف الحقائق ، مرتبہ ڈاکٹر وہاب اشرفی ، ص ۴۵۵

شاعری بھی عیوب سے پاک نہیں ہے ۔ ان کا خیال ہے کہ ایسے طبائع جن پر انگریزی کا پورا مرتب سوار ہے اور جو غزل کو انگریزی مذاق کی روشنی میں اصلاح دینا چاہتے ہیں نہ تو غزل کی اصلاح کر سکتے ہیں اور نہ ایسے انگریزی شاعری کے ہم مقابلہ کر سکتے ہیں ۔ ان کا اصرار ہے کہ غزل وہ صنف شاعری ہے جو مضامین عشقیہ کے لئے موزوں کی گئی ہے ۔ اس میں دوسرے مضامین کے لئے گنجائش نہیں نکل سکتی ۔ اس لئے غزل میں واعظ و پند کے مضامین کو برتنے کے سلسلے میں اثر کا خیال ہے کہ غزل سرائی کو پند و موعظت سے عداوت نہیں ہے ۔ غزل ایسی نازک صنف شاعری ہے جو سعدی اور پند نامہ عطار کی مضمون بندی کی متحمل نہیں ہو سکتی اس طرح فطری مضامین کے بیان کے لئے غزل موزوں صنف نہیں ہے ۔

اثر کہتے ہیں ۔

"اس صنف شاعری کو مرد عالم درونی کی سیر درکار ہے ۔ غزل گو کو کوئی حاجت نہیں ہے کہ کوہ کوہ پتھروں کو یا دریا دریا موجوں کو گنتا پھرے ۔ نیچرل سینریوں کے لئے مثنوی موزوں ہوئی "[1]

مسلسل غزل کے سلسلے میں بھی اثر اردو شاعری کی روایت پر چلتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ ان کا خیال ہے کہ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس میں محض دو مصرعوں میں نازک سے نازک اور دشوار سے دشوار مضامین برتے جا سکتے ہیں ۔ یہ امتیاز محض فارسی اور اردو غزل کو حاصل ہے ۔ آخر میں وہ غزل کے شعرا ان اصلاح کی گرفت اس لئے بھی کرتے ہیں کہ وہ ردیف اور قافیے کو شاعری سے ختم کرنے پر مصر ہیں ۔ اثر کا خیال ہے کہ یہ انگریزی ادب کی غلامی یا اپنے سرمایۂ ادب سے احساس کمتری کی وجہ سے ہے ۔ انگریزی اور دوسری زبانوں میں قوافی کی کمی کی وجہ سے بلینک ورس کو اپنانے کی نوبت آئی ۔ اردو میں یہ صورت حال نہیں ہے ۔ اثر کا یہ خیال ہے کہ بودی طبیعت کے لوگ بلینک ورس

۱۔ سید امداد امام اثر ، کاشف الحقائق ، مرتبہ ڈاکٹر وہاب اشرفی ، ص ۴۶۵

مین بھی غزل نہین لکھ سکتے اور اسی شاعر تمام فنی پابندیون کے باوجود غزل مین امتیاز حاصل کرسکتے ہین ۔

اثر کی تنقید کا یہ حصہ غالباً حالی کے "مقدمہ شعر و شاعری" مین غزل کی اصلاح کے سلسلے مین اٹھائے گئے سوالات کا جواب ہے ۔ اس لحاظ سے اثر حالی کے مقابلے مین زیادہ درست نظر آتے ہین مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ محض روح لشیہ عصر سے مرعوب نہین ہین اور غزل کی روح کو اچھی طرح سمجھتے ہین ۔ ان کی تنقید مین جو غلو ، افراط و تفریط اور بے جا رجحان نظر آسکتا ہے مگر اس کے ساتھ ہم یہ محسوس کرسکتے ہین کہ اردو غزل کو انھون نے تاریخی پس منظر اور فنی لوازمات اور معاشرتی تقاضون کے تحت خاص زاویے سے دیکھا اور پرکھا ہے ۔

امداد امام اثر اردو کے کلاسیکی دور کے نقادون مین ایک ممتاز مقام رکھتے ہین ۔ بیسوین صدی کے عینک سے دیکھنے پر ان کا تنقیدی ساز و سامان پرانا ، مغربی علوم سے ان کی معلومات سطحی اور انداز بیان اکثر اوقات واعظانہ نظر آتا ہے لیکن اگر ہم "کاشف الحقائق" کو انیسوین صدی کے اواخر مین اردو ادب کے تنقیدی سرمایہ کی روشنی مین دیکھین تو موصوف کے وسعت نظر اور سخن فہمی مین شبہ کی گنجائش نہین رہ جاتی ۔ اثر نے نہ صرف شعر و شاعری کے رموز پر اپنے مخصوص انداز مین بحث کی ہے بلکہ اردو فارسی کے مروجہ اصناف اور مشاہیر کے کمالات کو جس طرح اجاگر کیا ہے وہ انھین کا حصہ ہے ۔ اردو غزل چونکہ ایک سیکولر صنف ہے لہذا اس پر تنقید کرتے ہوئے اثر مذہبی جوش سے مغلوب نہین ہوتے ۔ ولی سے لیکر آتش و رند تک تمام مشاہیر کے کلام پر انھون نے متانت سے تنقید کرنے کی کوشش کی ہے ۔

امداد امام اثر نہ صرف تنقید کے فن اور اس کی اہمیت سے واقف ہین بلکہ وہ تنقید و تقریظ کو بھی بخوبی جانتے ہین ۔ انھین اس کا احساس تھا کہ وہ صنف ادب جسے انگریزی مین کرتی سزم (CRITICISM) کہتے ہین فارسی اور اردو مین مروج نہین

ہمارے یہاں انیسویں صدی کے آخر تک تقریظوں ، تذکروں اور تبصروں میں ہی تنقید کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ تھی ۔ امداد امام اثر نے شعرائے غزل پر تنقید کے لئے چند معیار قائم کئے ۔ ان کی تنقید میں معروضی یا سائنٹفک انداز کم ہے وہ اکثر اوقات تاثراتی انداز اختیار کرلیتے ہیں اور ایسے پسندیدہ شاعروں کی تعریف میں زمین و آسمان کی قلابیں ملانے لگتے ہیں ۔ شاید ایک حد تک اثر کی تنقید میں تاثراتی انداز تقریباً ناگزیر ہے ۔ وہ تذکروں اور تقریظوں کے اسلوب سے یکسر بے نیاز نہیں ہوسکے تھے اور نہ وہ ایک سے میں بیسویں صدی کی تنقید لکھ سکتے تھے ۔ حالی کے یہاں تاثراتی انداز اس لئے کم نظر آتا ہے کہ انہوں نے آزاد یا امداد امام اثر کی طرح مشاہیر کے کلام پر تفصیلی بحث نہیں کی ہے ۔ بلکہ محض اصناف کو بھی مد نظر رکھا ۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ امداد امام اثر کے زمانے میں اردو میں تنقید کے معقول نمونے نہیں تھے لیکن انہوں نے اپنی فطری ذہانت اور سخن شناسی سے ہی تنقید کو جنم دیا وہ قدیم و جدید کے درمیان ایک کڑی کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اردو غزل گویوں پر انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی دقت نظر ، معروضیت ، تقابلی مطالعہ کو اچھی طرح واضح کرتے ہیں ۔ غزل گو شعراء کی خصوصیات واضح کرنے کے لئے انہوں نے جو انتخاب کلام پیش کیا ہے وہ واقعی قابل داد ہے ۔ امداد امام اثر نے نثر میں مکالمات اور مطالبات کے مطابق اردو تنقید کو نئے اصطلاحات اور اسالیب سے مالامال کیا ۔ اور شعر و ادب کی اندرونی کائنات کا جائزہ لے کر اس کے تمام رموز و نکات کو ہمارے سامنے پیش کیا ۔ اگر ہم نیاز فتحپوری ، فراق گورکھپوری مسعود حسن رضوی ، مجنوں گورکھپوری ، آل احمد سرور اور کلیم الدین احمد کے تنقید انتخابات پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ان کا سلسلہ آزاد اور حالی کے ساتھ سید امداد امام اثر سے مربوط ہے ۔

حاصل کلام

حاصل کلام

غزل اردو کی سب سے اہم اور قدیم ترین صنف سخن ہے۔ اردو شاعری کی ابتدا غزل سے ہی ہوئی اور اب تک کوئی ایسی صنف نہیں ہے جسے یہ مقبولیت حاصل ہوئی ہو۔ کبھی یہ خانقاہوں میں عشق حقیقی اور معرفت کا ترجمان بنی تو کبھی درباروں میں اور محفلوں میں سامعین کے جمالیاتی ذوق کو ابھارتی رہی۔ ارباب نشاط نے غزل کو مخصوص طبقوں کی عیش کوشی کا ذریعۂ اظہار بنایا اور رفتہ رفتہ یہ بازاروں اور میلوں ٹھیلوں تک پہنچی۔ زمانۂ حال میں تھیٹر اور فلم نے غزلوں کو بڑی مقبولیت بخشی ہے۔ ظاہر ہے کہ اعلیٰ درجے کی غزلیں جن میں حیات و کائنات کے رموز و نکات اور کیفیات ذہنی و واردات قلبی شعر کے سانچے میں ڈھلتے ہیں کم پڑھے لکھے لوگوں اور عوام کو پسند نہیں آسکتے۔ وہ غزل میں ایسے جذبات کی ترجمانی دیکھنا چاہتے ہیں جو خود ان کے دلوں کی آواز ہو۔ یہی وجہ ہے کہ غزل میں جب خال عشقیہ یا مجازی عشق کو عوام کی سطح پر پہنچا دیا گیا تو ایک طرف اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوا مگر دوسری طرف فن مجروح ہونے لگا۔ کسی کی دور کے تذکرہ نگاروں کے زمانے سے لے کر آزاد، حالی اور امداد امام اثر تک سب ہی نقاد غزل میں ان عناصر کی گرفت کرتے ہیں جن سے مغرب اخلاق موضوعات غزل میں در آتے ہیں۔ وہ رکاکت، فحاشی، عریاں نگاری کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں لیکن یہ ایک حد تک ناگزیر ہے۔ دور الزبتھ میں انگریزی ڈرامہ نے فن کے آخری مدارج طے کر لئے تھے لیکن شکسپیر جیسے تمثیل نگار کو بھی عام تماشہ بینوں کے مذاق اور ان کی پسند کا لحاظ رکھنا پڑا۔

اردو غزل کی تنقید میں محض اخلاقی پہلو بھی ہی نمایاں نہیں بلکہ اس کے فن اور اجزائے ترکیبی میں ایسے عناصر موجود ہیں جن کی نقادوں نے وضاحت کی ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ غزل نے اردو شاعری کی تاریخ میں اپنی دلفریب موسیقیت، دلگداز،

نغمگی ، اور پرسوز انسان دوستی کے نقوش چھوڑے ہیں ۔ اس میں محض زندگی کی ترجمانی ہی نہیں بلکہ اعلیٰ و لطیف لمحات کو تخلیق کی نئی شکل دی گئی ہے ۔ غزل کی تنقید کے سلسلے میں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ تذکرہ نگاروں نے زبان و بیان ، صنائع بدائع کے استعمال ، روزمرہ و محاورہ اور لطف ادا پر زیادہ زور دیا ۔ غزل کے موضوعات تمام شاعروں کے یہاں ابتدائی دور میں یکساں ہی تھے ۔ لیکن ہر شاعر کا اپنا اسلوب تھا اور اپنا منفرد انداز بیان ۔ میر اور دوسرے تذکرہ نگاروں نے غزل کی تنقید میں اپنی پسند و ناپسند کو بھی ظاہر کیا ہے ۔ آزاد غزل کے اچھے پارکھ ہیں لیکن وہ بھی تغزل اور پرزور ادا صفائی و سلاست پر خاص زور دیتے ہیں یہاں تک کہ وہ غالب کے کلام کی معنویت اور فکری بلندی کو نظر انداز کرکے ملک الشعرائی کا تاج استاد ذوق کے سر رکھتے ہیں ۔ وہ غزل کے موضوعات میں وسعت دینا چاہتے ہیں لیکن ان کا ذہن پوری طرح سے صاف نہیں ہے ۔ حالی نے نیچرل شاعری کو معیار بنا کر غزل کو نیا رویہ دینے کی تلقین کی ۔ وہ قدما کے شعری عظمت کے قائل ہیں مگر زمانے کے نئے تقاضوں کے پیش نظر یہ بھی برتتے ہیں کہ اب " کانگڑے " اور بھاگ کا وقت نہیں رہا ۔ جوگیٹے کے الاپ کا وقت ہے ۔ " مقدمہ شعر و شاعری " کے اشاعت کے دو سال کے اندر امداد امام اثر نے " کشف الحقائق " اور " کاشف الحقائق " لکھی اور جذباتی انداز میں غزل کی پرزور حمایت کی ۔ انھوں نے آزاد اور حالی کی غزل پر تنقید کو بڑے جذباتی انداز میں تردید کرتے ہوئے متقدمین کی شاعری کی مدح سرائی کی ہے ۔ ان کے نزدیک غزل خالص باطنی جذبات کی ترجمان ہے اس لئے اسے واردات قلبیہ اور کیفیات ذہنیہ تک ہی خود کو محدود رکھنا چاہئے ۔ خارجیت ، معاملہ بندی ، سیاسی و معاشرتی مسائل ، اخلاقی و معاشرتی موضوعات ان کے نزدیک غزل کے لئے مناسب نہیں ۔

میر ، مومن ، غالب اور آتش نے اردو غزل کو معراج کمال تک پہنچا دیا لیکن

انیسویں صدی کے اواخر میں امیر و داغ نے ایک نئے انداز سے غزل گوئی شروع کی جس کا رد عمل حالی کی تنقید میں ظاہر ہوا اور بیسویں صدی میں حسرت ، فانی ، اصغر ، اسباق ، فراق اور فیض جیسے شاعروں نے غزل کے دامن کو نئے موضوعات سے مالا مال کیا ۔ اور اسے نئی شعری لطافتوں اور جمالیاتی و دیگر اعلیٰ اقدار سے روشناس کیا ۔ غرض یہ کہ غزل کی معنویت اور جامعیت میں حیرت انگیز اضافے ہوئے لیکن اس کے فن اور تکنیک میں کوئی انقلاب نہیں آسکا ۔ غزل اب بھی منفرد اشعار کا مجموعہ ہے جس میں اکثر اوقات متضاد کیفیات کا بیان ہوتا ہے یا ایسے جذبات کی ترجمانی کی جاتی ہے جن کے درمیان کوئی تسلسل نہیں ہوتا ۔ بیسویں صدی کے مشہور ادب و نقادوں نے غزل کی ماہیت اور معنویت پر فکر انگیز مقالے لکھے ہیں اور اس کے اندرونی کائنات کو اجاگر کیا ہے ۔

حالی اور کلیم الدین احمد کے درمیان کم و بیش سو برسوں کے ادب و غزل پر تنقید کا جائزہ لینے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اگر ایک طرف ادب و غزل میں نو بہ نو وسعتوں کا اظہار ہوتا ہے تو دوسری طرف جدید تنقیدی نظریات کی روشنی میں صنف غزل پر تنقید کے نئے پہلو بھی سامنے آئے ہیں ۔ آزاد اور حالی تو سرسید تحریک کے زیر اثر یہ احساس ہوا کہ ادب و شاعری کی اصلاح کے لئے غزل کی اصلاح سب سے ضروری ہے ۔ آزاد نے انگریزی لائبریریوں سے روشنی حاصل کرنے کی تلقین کی اور حالی نے نیچرل شاعری کو اپنا معیار بنایا ۔ ان مناظر کا تقاضا ادب و غزل کو رکاکت ، تصنع ، بے کیفی ، مبالغہ اور صنائع بدائع کی زنجیروں سے آزاد کرنا تھا ۔ " مقدمہ شعر و شاعری " کی اشاعت کے بعد تقریباً " چالیس پچاس سال تک غزل کی تجدید و احیاء " کا کام جاری رہا ۔ فراق اور مجنوں گورکھپوری دونوں ادب و شاعری کے بڑے صاحب فکر نقاد گزرے ہیں

دونون نے مغربی شاعری اور تنقید کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور ان کا رچا ہوا مذاق صنف غزل سے بہت حد تک ہم آہنگ ہے لہذا ان دونون نقادون کے یہان غزل کی تنقید کے نئے پہلو نظر آتے ہین ۔ میر ، قائم ، غالب ، حسرت و فانی کے فن پر ان نقادون کے مضامین تخلیقی حیثیت رکھتے ہین ۔ ہمارے دیدہ ترین ناقدین کے خیالات سے اردو غزل کے روشن مستقبل کی بشارت ملتی ہے ۔

کتابیات

کتابیات

۱۔ ابواللیث صدیقی	غزل اور متغزلین	بھارتی پبلیکیشنز متیا محل دہلی	۱۹۶۸ء
۲۔ اختر انصاری	غزل اور دوسرا غزل (دوسرا ایڈیشن)	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۷۷ء
۳۔ الطاف حسین حالی	مقدمہ شعر و شاعری مرتبہ وحید قریشی	"	۱۹۸۱ء
۴۔ آل احمد سرور	نئے اور پرانے چراغ	ادارہ فروغ اردو لکھنؤ (تیسرا ایڈیشن)	۱۹۵۵ء
۵۔ "	تنقیدی اشارے	ادارہ فروغ اردو لکھنؤ	۱۹۵۵ء
۶۔ ڈاکٹر حنیف نقوی	شعرائے اردو کے تذکرے (نکات الشعرا سے گلشن ہند تک)	نسیم بک ڈپو لکھنؤ	۱۹۷۶ء
۷۔ سید عبدالسلام	تنقیدیں (طبع سوم)	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۵۷ء
۸۔ رشید احمد صدیقی	دید غزل	سرفراز پریس لکھنؤ	۱۹۵۵ء
۹۔ ڈاکٹر سید عبداللہ	شعرائے اردو کے تذکرے	مکتبہ شعر و ادب دہلی	
۱۰۔ سید عابد علی عابد	اصول انتقاد ادبیات	مجلس ترقی ادب لاہور	
۱۱۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری	روح تنقید	مکتبہ معین الادب لاہور	۱۹۵۵ء
۱۲۔ سید سجاد (مرتب)	آب حیات کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ	اعجاز پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی	۱۹۸۱ء
۱۳۔ سید امداد امام اثر	کاشف الحقائق مرتبہ ڈاکٹر وہاب اشرفی	ترقی اردو بورڈ نئی دہلی	۱۹۸۲ء
۱۴۔ عبادت بریلوی	غزل اور مطالعہ غزل	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۸۳ء
۱۵۔ عبدالشکور	اردو ادب کا تنقیدی سرمایہ	عزیزی پریس رامپور	۱۹۵۱ء
۱۶۔ غلام ہمدانی مصحفی	تذکرۂ ہندی مرتبہ عبدالحق	انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)	۱۹۳۳ء
۱۷۔ فراق گورکھپوری	رسالہ اصناف سخن نمبر (سالنامہ نوری مفروری)		۱۹۵۷ء

۱۸ـ قدرت اللہ شوق	طبقات الشعرا مرتبہ نثار احمد فاروقی	مجلس ترقی ادب لاہور
۱۹ـ میر تقی میر	نکات الشعرا مرتبہ مولوی عبد الحق	حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۲۵ء
۲۰ـ میرزا علی متخلص بہ لطف	گلشن ہند	دارالاشاعت لاہور ۱۹۰۶ء
۲۱ـ محمد حسین آزاد	آب حیات	اتر پردیش اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۱ء
۲۲ـ پروفیسر مسعود حسن رضوی	آب حیات کا تنقیدی مطالعہ	کتاب نگر لکھنؤ ۱۹۵۳ء
۲۳ـ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ	گلشن بے خار	منشی نولکشور لکھنؤ
۲۴ـ ڈاکٹر یوسف حسین خان	اردو غزل	انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ ۱۹۵۷ء
۲۵ـ ڈاکٹر عبادت بریلوی	اردو تنقید کا ارتقا	انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۶۱ء